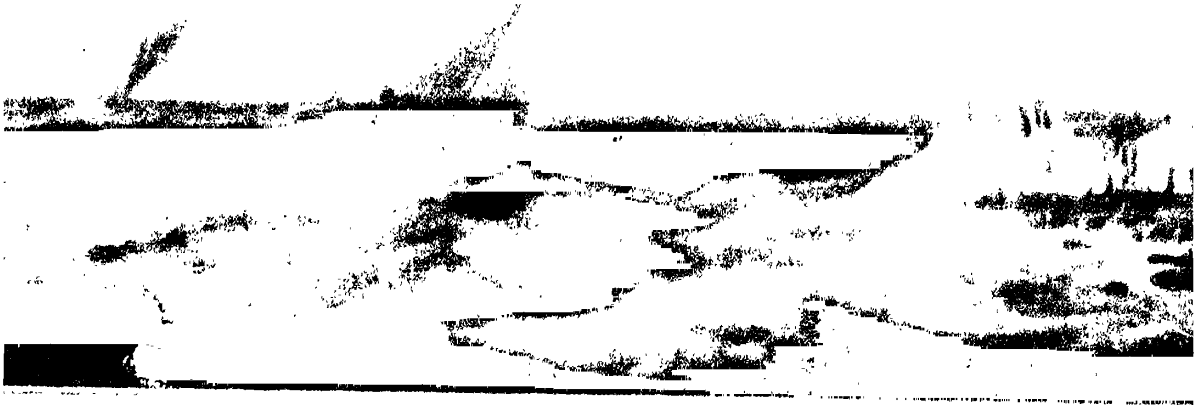
ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی



جلد : ۵ شمارہ : ۹

جنوری ۱۹۹۱ء



اس تصویر کے لیے کوئی مناسب شعری یا نثری عنوان تجویز کیجیے۔ نثری عنوان کسی مشہور شاعر کی نظم یا افسانہ نگار کے افسانے کے عنوان سے مستعار ہو تو بہتر ہے۔ پسندیدہ عنوانات اگلے شمارے میں ارسال کنندگان کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ عنوان بھیجتے ہوئے شاعر یا افسانہ نگار کا نام لکھنا نہ بھولیں۔

اِس صفحے کے لیے قارئین بھی، ہمیں ایسی تصویریں بھیج سکتے ہیں جو ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو پیش کرتی ہوں۔ پسند آنے والی تصاویر بھیجنے والوں کے نام سے شائع ہوں گی۔

فون نمبر: ۳۲۶۳۴۴۸، ۳۲۷۶۲۱۱

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۴ — شمارہ: ۹ — فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — جنوری ۱۹۹۱ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی
اردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

آغاز

ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جو مختلف نسلی، تہذیبی اور مذہبی گروہوں کا قدیم مسکن ہے باہمی رواداری کے جذبے کی موجودگی اور پاسداری بہت ضروری ہے۔ ہمارے اسلاف اس حقیقت سے واقف تھے اسی لیے انھوں نے ایک ایسی تہذیبی روایت کی بنیاد ڈالی اور اسے فروغ دیا جس میں ہر عقیدے اور مسلک کے لیے احترام موجود تھا اور مختلف عقیدوں اور مسلکوں کے پیرو اپنے اپنے گروہی تشخص کے ساتھ اس روایت کی پروردہ فضا میں نہ صرف امن و اماں کے ساتھ زندگی گزار سکتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے دُکھ درد کے شریک بھی تھے۔ ذہنی اور جذباتی رواداری اور ایک دوسرے کے روحانی اور اخلاقی معیاروں کی پاسداری کا یہی ماحول تھا جسے ہم ہندوستانیت سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ ہمارے زمانے کے سربرآوردہ شاعر فراق گورکھپوری نے یہی بات اپنے لفظوں میں اس طرح کہی ہے:

سرزمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا

فراق سے بہت پہلے ذوق نے اسی نکتے پر ان لفظوں میں زور دیا تھا:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس پیغام کو عام کرنے میں ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ صوفیوں اور سنتوں کا بھی زبردست رول رہا ہے ہمارے صوفیوں اور سنتوں کے دروازے ہر مذہب و مشرب کے پیروکاروں کے لیے کھلے ہوئے تھے اور وہ سب کو یکساں محبت اور شفقت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ: بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ——— ان اعضا کی یک جائی اور ہم آہنگی ہی سے انسانی سماج وجود میں آتا ہے اور اس سماج کی صحت مندی اِس پر منحصر ہے کہ ہر عضو اپنی جگہ چاق و چوبند ہو۔ اگر کسی ایک عضو کو ضرر پہنچا کر کمزور کردیا جائے تو باقی اعضا کی کارکردگی بھی لازماً متاثر ہوگی اور دھیرے دھیرے پورا نظام معطل یا منتشر ہو کر رہ جائے گا۔

ہندوستان کی موجودہ صورتحال ان سبھی لوگوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ پیدا کرتی ہے جو اس ملک کی سلامتی، ترقی اور خوشحالی کے خواہاں ہیں۔ بڑے اور دُور رس قومی مفادات پر ادنیٰ قسم کے فوری سیاسی مفادات کو ترجیح دینے کا رجحان جس طرح عام ہوتا جارہا ہے وہ ہمیں بہت خطرناک نتائج تک لے جاسکتا ہے۔ اس رجحان پر فوری روک لگانے کی ضرورت ہے اور یہ مقصد صرف رائے عامّہ کی صحیح تربیت کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگر رائے عامّہ بیدار ہوگی تو خود غرض سیاستین کا چھوٹا سا گروہ کسی طرح اس کا مقابلہ نہیں کرسکے گا، اسے یا تو سیدھی راہ پر آنا ہوگا یا پھر وہ اس طرح الگ تھلگ جا پڑے گا کہ ملک کی حیاتِ اجتماعی میں اس کا کردار غیر اہم ہو کر رہ جائے۔

رائے عامّہ کی تربیت میں ہمارے قلمکار بھی قابلِ لحاظ کردار ادا کرسکتے ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ اپنی اس ذمّے داری کو محسوس کریں گے۔

——— سید شریف الحسن نقوی

ساجدہ زیدی
گلبرگ، دودھ پور، سول لائین، علی گڑھ (یو۔پی)

مسدُود راہیں

چلیں کوئی سمت ایسی ڈھونڈیں
کہ جس کے گہرے گھنے اندھیروں میں کھو بھی جائیں
تو چشمِ بینا سے دیکھ پائیں

قدم بڑھائیں
تو گوشہ در گوشہ، کنج در کنج
ایسی مدہوش کن نئی رہگذاریں آئیں
جو ہر قدم کو سفر بنائیں
جہاں اندھیروں کی کوکھ سے آفتاب کی خیرہ کن شعاعیں
زمیں کے چہرے ___ زماں کے اسرار سے وہ پردے سبھی ہٹائیں
جنھوں نے ذہن و دل و نظر کی تمام لرزش کو
کم سوادی کے، کم نگاہی کے، سرد مہری کے
تنگ و تاریک قید خانوں میں کھو دیا ہے

چلیں کوئی سمت ایسی ڈھونڈیں
جہاں اگر چشمِ شوق وا ہو،
تو سب مناظر تمام ماحول
بہ شکلِ آئینہ
پرتوِ حسن و آشتی، عکسِ نورِ حق ہو

تمام مسدود راستے وا کریں تمازت سے جسم و جاں کی
چلیں کوئی سمت ایسی ڈھونڈیں
جو سب فصیلوں کو توڑ دے
جس سے ایسی راہیں ہزار نکلیں
جہاں یہ نیرنگیِ نظر
مشعلِ سفر ہو
خلوصِ جاں زادِ راہ ہو،
آگہی و تخیّل و جستجو زادۂ سفر ہو
یہ راہ شاید نظر سے کچھ دور بھی نہیں ہے
کہ دل کے گوشوں سے ایک بیباک روشنی
چھن کے آ رہی ہے

ابوالفیض سحر

اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ

ماہ لقا بائی چندا

دکن کا خطۂ ارض، اُردو زبان وادب، اُردو تہذیب و ثقافت اور مختلف علوم و فنون کے فروغ کے لیے اساسی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ دیگر امور سے قطع نظر، صرف شعر و سخن کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو حیران کن حقیقت کے پُرشکوہ باب در باب وا ہوتے ہیں۔ نثر اردو کی اوّلین تصنیف ملا وجہی کی "سب رس" اپنی گوناگوں نثری خصوصیات اور فنی اسالیب کے ساتھ اسی سرزمین پر تخلیق ہوئی۔ اُردو کے اوّلین مرثیہ نگاروں اور قصیدہ نگاروں نے بھی اپنی علمی، ادبی اور فنی و فکری وجاہتوں کے ساتھ یہیں کے سبزہ زاروں اور یہیں کے بام و در سے آواز بلند کی تھی۔ اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر، سلطان قلی قطب شاہ ہے۔ جدید لب و لہجے کی معیاری غزل کے امام اوّل وَلی دکنی ہی ہیں جنھوں نے شمالی ہند میں اردو غزل کی شمع روشن کی۔ اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ، ماہ لقا بائی چندا بھی اسی خاکِ دکن کے مطلعِ شعری پر ایک نقشِ تابندہ کی صورت نمایاں ہوتی۔ اس طرح ایک سلسلہ ہے چراغوں کا جو علم و فن اور تہذیب و ثقافت کے جادۂ ارتقا کو منوّر کرتا ہے۔

ماہِ لقابائی چندا کا سلسلۂ نسب بڑی حد تک گنجلک اور پیچیدہ ہے۔ اختصار سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں بے مثل عظمتِ مغلیہ پارہ پارہ ہو رہی تھی اور بابری جاہ و جلال، محمد شاہ رنگیلے کے لرزیدہ پیروں تلے پامال ہو رہا تھا، ایک شخص خواجہ محمد حسین، قصبۂ بارہہ سے دہلی آیا۔ اپنی موقع شناسی، سلیقہ مندی اور فنونِ لطیفہ میں مہارت کے باعث دربارِ دہلی میں مقام پیدا کر لیا پھر احمد آباد میں مقامی حاکم کی جانب سے مالگزاری وصول کرنے پر مامور ہوا۔ گجرات کی ایک شریف خاندان کی لڑکی چندا بی بی سے عقد کیا۔ کئی اولادیں ہوئیں۔ پانچ بچے زندہ رہے۔ خواجہ محمد حسین اوباش اور عیاش تھا۔ آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا تھا۔ سرکاری روپیہ بھی عیاشی میں اڑا دیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواجہ محمد حسین کو ملازمت چھوڑ کر جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ حاکم وقت نے اس کا مال و اسباب سب ضبط کر لیا۔ اس کے بیوی بچوں کو بھی قید کر لیا۔ حالتِ قید میں بیچاری چندا بی بی نے جو کچھ پاس تھا بیچ کر گزارا کیا مگر جب نوبت فاقوں تک پہنچی تو بچوں کو لے کر وہ بھی فرار ہو گئی۔ ایک گاؤں میں پناہ لینی چاہی، اتفاق سے وہاں اربابِ نشاط کا قافلہ خیمہ زن تھا۔ انھوں نے کچھ دنوں سہارا دیا۔ بالآخر چندا بی بی کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو رقص و موسیقی کی تعلیم دیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبوراً چندا بی بی جیسی پاکباز عورت کو، اپنی لڑکیوں کو ناچ گانے کے پیشے میں ڈال دینا پڑا۔ اس کی تین لڑکیوں میں نور بی بی نے برج کنور بائی، مونس بی بی نے مونس کنور بائی اور سیدہ بی بی نے راج کنور بائی کا نام اختیار کیا۔ کچھ ہی دن بعد انھیں کافی شہرت حاصل ہوئی اور ان کے تعلقات راجاؤں اور اُمراء سے ہو گئے۔

شہر حیدرآباد علم و فن کی فیاضانہ سرپرستی کے لیے دُور دُور تک مشہور تھا۔ جب یہ لوگ حیدرآباد پہنچے تو آصفی امرا راج کنور بائی کے فنِ رقص سے متاثر اور اس کی سرپرستی پر آمادہ ہوئے۔ اسی زمانے میں راج کنور بائی کے تعلقات بسالت خاں بخشی صرفِ خاص سے ہو گئے۔ اس کا اصل نام بہادر خاں تھا۔ لیکن حُسنِ کارکردگی کی وجہ سے خاندانی خطاب بسالت خاں بھی عطا ہوا تھا۔ راج کنور بائی کو بسالت خاں سے ایک لڑکی ۲۰ ذیقعدہ ۱۱۸۱ھ کو (۱۷۶۶ء) تولد ہوئی جس کا نام چندا بی بی رکھا گیا۔ اس موقع پر شاندار جشن منعقد ہوا جس میں امرا اور روسا شریک ہوئے۔ کچھ عرصے بعد، راج کنور بائی نے مہتاب کنور بائی محل احتشام جنگ رکن الدولہ کے کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے چندا بی بی کو انھیں گود دے دیا۔ یہی بچی جوان ہو کر ماہ لقا بائی چندا ہوئی۔

چندا بی بی کی تعلیم و تربیت مہتاب کنور بائی (صاحب جی صاحبہ) کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ موسیقی کی تعلیم کے لیے اُستاد خوشحال خاں کلاونت



I-623، سروجنی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

مقرر کیے گئے جو استاد تان سین کے خاندان سے تھے۔ صاحب جی صاحبہ کی خصوصی توجہ کی وجہ سے چندا بی بی کو اپنے فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ جہاں وہ موسیقی میں یکتا بنی وہیں اپنے سلیقے اور آن بان میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی اسے اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ اکثر مہمات میں بھی وہ ان کے ہم رکاب رہا کرتی تھی۔ ایک مہم میں کامیابی پر ایک خصوصی جشن منایا گیا اور اسی موقعے پر چندا بی بی کو ماہ لقابائی کے خطاب اور نوبت اور نقارے سے سرفراز کیا گیا جو ایک طرح سے امرا ہی کا اعزاز ہوا کرتا تھا۔

آصف جاہ ثانی کے انتقال کے بعد ماہ لقابائی چندا شاہی سرپرستی سے محروم نہیں ہوئی بلکہ نواب سکندر جاہ آصف جاہ سوم کی عنایات کے زیر سایہ آ گئی ساتھ ہی مدارالمہام (وزیر اعظم) ارسطو جاہ سے بھی اس کے گہرے تعلقات رہے ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد ماہ لقابائی چندا کے تعلقات نئے مدارالمہام نواب میر عالم سے قائم ہو گئے وہ خود بھی شاعر تھے۔ اس لیے ماہ لقابائی چندا کی صحبت اس کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے محظوظ ہوتے تھے۔ چندا صاحبِ ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ زیرک بھی تھی اور دنیاوی معاملات کو خوب سمجھتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ کئی نوابوں اور امرا کو لگاتار متاثر کرتی رہی۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے:

چندا کے دیکھنے ہی کی خواہش کرے جو کوئی
رکھتا ہو وصف اپنے میں عزت و جاہ کا

میر عالم کو چندا سے اس قدر محبت تھی کہ انھوں نے چندا کے ہوش رُبا سراپے اور اس سے اپنے والہانہ عشق کے اظہار کے لیے ایک مثنوی لکھی۔ یہ مثنوی کافی مشہور ہوئی۔ چندا نے خود بھی اس مثنوی کی خوب تشہیر کی تاکہ دربار، امرا اور اہلِ ذوق حلقوں میں اس کی شہرت اور مقبولیت میں مزید اضافہ ہو۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ چندا کے حسن و جمال، فنی کمال اور اس کی دل نواز شخصیت اس کی بزمِ موسیقی کے جلووں اور پھر اس کے ادبی ذوق کے چرچے جا بجا ہونے لگے۔ اس مثنوی کے چند شعر یوں ہیں:

اے ماہ سپہر روشنائی
سر تا پائے تو دلربائی

اے مردمِ دیدۂ محبت
سر تا قدمت طلسمِ اُلفت

شکلِ تو بہ ملکِ دل مصوّر
جسم تو بہ آبِ جاں مقطّر

اے حسنِ تو دلربائیِ عشق
آئینۂ خود نمائیِ عشق

ماہ لقابائی چندا اُردو کی پہلی شاعرہ ہے جس نے ایک مکمل دیوان اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا۔ وہ زیادہ تر تفریح کے طور پر شعر کہا کرتی تھی اس لیے اس کی شاعری میں اساسی قدریں نہیں ہیں۔ ہاں موسیقی کی تعلیم باضابطہ پائی تھی اور اس کی زیادہ توجہ اسی فن پر مرکوز تھی۔ . . . ٹھاٹ باٹ سے رہتی تھی۔ زندگی کی تمام راحتیں اور تمام آسائشیں اسے حاصل تھیں اس کا کلام ایک ایسی عورت کی آواز معلوم ہوتا ہے جو حُسن و شباب کے نشے میں چُور اور اپنی فاتحانہ قوتوں پر حد درجہ مغرور و نازاں ہو کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید اسے حقیقی اور دائمی محبت کی بھی تلاش و جستجو رہی ہو مگر شاید وہ وقت اور حالات مسخر کرتے رہنے کو ہی کامیابی خیال کرتی رہی۔ شوخی و شرارت اور عریانی کے بعض مضامین بھی اس نے اپنے کلام میں نظم کیے ہیں۔ "تذکرۂ دربارِ حیدرآباد" میں جناب رمن راج سکسینہ نے لکھا ہے کہ چندا نے ۱۲۲۶ھ م ۱۸۱۱ء میں اپنا دیوان مرتب کیا جس میں ایک سو پچیس غزلیں ہیں اور ہر غزل پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ تعداد پنجتن کی رعایت سے رکھی گئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا مذہبی مسلک کیا تھا۔ ماہ لقابائی چندا کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ سنٹرل لائبریری حیدرآباد (کتب خانۂ آصفیہ) میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دیوان کا ایک نسخہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے کتب خانے میں بھی تھا۔ مزید یہ کہ اس کے دیوان کا ایک اور نسخہ برٹش میوزیم میں بھی موجود ہے اور یہ وہی نسخہ ہے جسے خود چندا نے



ماہ لقابائی چندا

ایک ناچ کے موقعے پر کپتان ملکم کو ۱۷۹۹ء میں بطور نذرانہ پیش کیا تھا۔

چنداؔ، حضرت ایماؔن سے اصلاح سخن لیا کرتی تھی۔ شیر محمد خاں ایماؔن ارسطو جاہ کے مصاحبِ خاص تھے اور استادِ علم و فن تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے:

لکھوں پہ کچھ اور بھی ایماؔن آبِ نقرہ سے
جو ہووے خامۂ الماس اور لوحِ بلور

مگر چنداؔ کی شاعری کو استاد کی شاعری سے کوئی علاقہ نہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اُردو" میں لکھا ہے کہ نواب ارسطو جاہ کے حکم سے ۱۲۱۳ھ میں چنداؔ کا دیوان مرتب کیا گیا تھا۔ چنداؔ کے کلام کی ایک اہم خصوصیت احساسات و جذبات کا بے باکانہ اور بَرمَلا اظہار ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سب میکدے میں مست ہیں، پر ایک تجھ سوا
دیکھا نہ لیے دور میں ہشیار اَب تلک

ساقی دے مجھ کو جامِ مَے ارغوان پھر
افسردہ دل میں آئے جو شعلہ سی جان پھر

مشک سے مطلب نہیں اس کو نہ عنبر سے غرض
ہے جسے صبح و مسا اس زلفِ دلبر سے غرض

ملتے ہیں توقع پہ تیری غیر سے کم ہم
رکھتے ہیں ترے دور میں یہ چشمِ کرم ہم

بنایا یار کی صورت کو وہ نقّاشِ قُدرت نے
کھچے نقشہ نہ ایسا مانی و بہزاد سے ہرگز

چشم کافر بھی ہے اور غمزۂ خونخوار بھی ہے
قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے

سو جان سے ہو گی وہ تصدق مرے مولا
چنداؔ کی جو کونین میں امداد کرے گا

بعض مقامات پر چنداؔ کے کلام میں شوخی و شرارت کی لے تیز ہو جاتی ہے جو بعد کو داغ اسکول کی بھی ایک خصوصیت سی بن گئی۔ جیسے:

ہم جو شب کو ناگہاں اس شوخ کے پالے پڑے
دل تو جاتا ہی رہا اب جان کے لالے پڑے

خود صید ہو گئے ہیں اب دام میں کسی کے
کرتے تھے آپ باہم تازہ شکار ہر شب

اہلِ حیدر آباد کی روایات اور بالخصوص قلی قطب شاہ بانئ شہر حیدر آباد کی طرح چنداؔ بھی ہر معاملے میں حضرت علیؓ سے مدد مانگنے والوں میں سے تھی۔ اس عقیدت کے نمائندہ چند اشعار:

مثلِ بلبل جو اسے دیکھے غزل خواں کیوں نہ ہو
یا علی چنداؔ ترے گلشن سے پاتی ہے بہار

گرمی وہ ہوئے حسن میں چنداؔ کے یا علی
جلوے کو اس کے دیکھ کے بس لوٹ جائے برق

چنداؔ کو بخش یا علی اپنی جناب سے
رُتبہ جو دو جہاں میں ہو افتخار کا

معروضہ یہ چنداؔ کا ہے نت شاہِ نجف سے
دیکھیں نہ کبھو گردشِ افلاک سے غم ہم

ماہ لقا بائی چنداؔ نہ صرف شاہانِ وقت کی منظورِ نظر رہی بلکہ وزرائے اعظم اور دیگر نواب اور جاگیردار بھی اس کے چاہنے والوں اور قدردانوں میں رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ فراست بھی تھی اور سلیقہ شعار بھی

ماہ لقا ہمیشہ قیمتی مکلف اور دیدہ زیب
لباس پہنتی تھی۔ جب دربار سے طلبی ہوتی تو
اسی شان اور آن بان سے حاضر ہوتی۔ دل موہ
لینے والے آداب اور سلام و کلام زرنگار سراپا
اور کمالاتِ رقص و موسیقی سے اپنی شخصیت
کی جاذبیت کے نقش دلوں پر چھوڑ جاتی۔ آخری
دور میں ماہ لقا بائی کے قدردانوں میں مہاراج
چندو لعل شاداںؔ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں ج
۱۲۴۸ھ میں مدار المہام سلطنتِ آصفیہ مقر
ہوئے تھے اور جن کا تعلق راجہ ٹوڈر مل کے
خاندان سے تھا۔ چندو لعل شاداںؔ نے ہی استا
ذوقؔ اور داغؔ کو حیدر آباد آنے کی دعوت د
تھی۔ چندو لعل شاداںؔ خود بھی ایک پُرگوشا
تھے اور شعرا کے بڑے مُربّی اور سرپرست
تھے۔ ان کی بارہ دری میں تقریباً ہر شب
مشاعرہ یا موسیقی کی محفل منعقد ہوا کرتی تھی
ان محفلوں میں ماہ لقا بائی چنداؔ کو بھی دعوت
شرکت دی جاتی تھی۔ ماہ لقا بائی چنداؔ خو
بھی باکمال ادیبوں اور شعرا کی مدد کیا کر
تھی۔ حافظ محمد تاج الدین مشتاق دہلوی، ج
خواجہ میر دردؔ کے تلامذہ میں سے تھے، جب
حیدر آباد آئے تو چنداؔ نے خاطر خواہ پذیرائی
مہمان نوازی کی اور پھر چنداؔ ہی کے توسط
مشتاق دہلوی، چندو لال شاداںؔ کے در
میں باریاب ہو کر رسوخ پا سکے۔ ایسی کئی مث
اور ہیں۔ وہ طبعاً علم دوست اور ادب نوا
فراغت ہوتی تو بیشتر وقت کتابوں کے مطا
میں گزارا کرتی تھی۔ اس کا ایک بڑا ذاتی کتب
تھا جس میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں خ
بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ چونکہ وہ زمانہ ط
کا نہ تھا اس لیے ماہ لقا بائی چنداؔ کے ہاں

ے بھی ملازم تھے جو حسبِ ضرورت کتابوں ل تیار کیا کرتے تھے۔ ماہ لقا چندا عالیشان یں رہا کرتی تھی۔ محل کے سامنے ایک عاشور تھا اور اس کے مقابل نقار خانہ تھا۔ مجلسی رنگینیوں اور بزم آرائیوں کی زندگی بسر کرنے ساتھ ساتھ وہ مذہبی مزاج بھی رکھتی تھی۔ محرم مہینے میں وہ لذیذ غذائیں ترک کر دیتی تھی اور ں کوشیوں سے بھی اجتناب کرتی تھی۔ عاشور ں میں نذر و نیاز بھیجا کرتی۔ خود اس کے ، کے سامنے والے عاشور خانے میں ماہِ محرم سیاہ مخمل کا فرش بچھا رہتا۔ ماہ لقا بائی چندا مارات تعمیر کروانے کا شوق بھی تھا۔ شہر ر آباد کے شمال مشرق میں واقع پہاڑی کوہ ' پر جہاں حضرت علیؑ سے وابستہ کچھ آثار اور ات کا آج بھی سلسلہ باقی ہے اس نے اپنا ہ' اس وقت کے تقریباً ایک لاکھ روپے اگت سے تعمیر کروایا تھا۔ حسینی علم' پرانا پل پر واقع درگاہ حضرت موسیٰ قادری کے قریب نے ایک چھوٹی سی مگر خوبصورت مسجد بھی تعمیر وائی تھی۔ اس مسجد کے دروازے پر ایک ہ ہے جس پر مسجد کی تعمیر کا مادۂ تاریخ "ثانی ت الحرام" (۱۲۰۳ھ) کندہ ہے۔

ماہ لقا بائی چندا کی فرمائش پر' غلام حسین جوہر منصب دار نے چندا کے کتب خانے سے فادہ کر کے ۱۲۲۸ھ میں ایک ضخیم فارسی تاریخ ب کی اور اسی کے نام پر اس کو "ماہ نامہ" سے م کیا۔ اس تاریخ کا ایک نسخہ سنٹرل لائبریری ر آباد (کتب خانہ آصفیہ) میں موجود ہے اس چندا کے خاندان کے حالات اور پھر اس کی رگی کے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس میں فصیلات درج ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ماہ لقا بائی چندا کے جدِّ اعلیٰ چغتائی برلاس تھے۔

چندا ہی کی فرمائش پر دکن کی ایک تاریخ "تاریخ دل افروز" کے نام سے مرتب ہوئی تھی۔ قدیم حیدرآباد کے ایک ادیب اور مورخ' غلام صمدانی گوہر نے ماہ لقا بائی کی سوانح حیات "ماہ لقا" کے نام سے شائع کی تھی اور ساتھ ہی اس کے دستیاب کلام کو ۱۳۲۴ھ میں "گلزار ماہ لقا" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ڈاکٹریٹ کے لیے ماہ لقا بائی چندا پر ریسرچ کی تھی۔ ان کی ایک کتاب "مہ لقا" کے نام سے شائع ہوئی ہے اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے وقت کی مشہور طوائف راج کنور بائی گجراتن کی بیٹی ماہ لقا بائی چندا محض طوائف ہی نہیں بلکہ بہت کچھ اور بھی تھی ورنہ وہ ایک غیر معمولی عورت بن کر اپنے وقت اور اپنے سماج پر اس طرح چھا نہیں سکتی تھی چندا غیر معمولی شخصیت کی حامل تھی اور مسحور کن حسن و شباب کے پہلو بہ پہلو دل نواز اخلاق اور سیرت سے بھی متصف تھی۔ فنِ رقص و موسیقی کی مہارت اور شعر و سخن سے دلچسپی نے بھی اس کی جامع صفات شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ ان کے علاوہ چندا کو مردانہ کھیلوں تیر اندازی' گھوڑ سواری' اور ورزش وغیرہ سے بھی دلچسپی تھی۔ چندا نماز کی سخت پابند تھی روزانہ تلاوت قرآن پاک بھی کیا کرتی تھی۔ ۵۶ سال کی عمر میں اس نے اس کوچۂ رنگ و بو کی ہنگامہ آرائیوں سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا اور کوہِ مولا کے پاس پہلے سے تعمیر شدہ اپنے مقبرے میں دفن ہوئی اس لیے مزار پر جو کتبۂ تاریخ لگا ہے۔ اس سے اس کی تاریخ وفات ۱۲۴۰ھ م ۱۸۲۴ء نکلتی ہے۔

ہاتف غیبی ندا داد ز تاریخ او
راہی جنت شدہ ماہ لقائے دکن
(۱۲۴۰)

ماہ لقا ذی وجاہت بھی تھی اور صاحب ثروت بھی۔ اس کے تمول کا یہ عالم تھا کہ جب اس کا انتقال ہوا اور اس کی دولت کا حساب لگایا گیا تو عمارات اور باغات کو چھوڑ کر نقد جنس جن میں ہیرے جواہرات بھی شامل رہے ہوں گے ایک کروڑ روپے کی مالیت کے نکلے تھے۔ ان کے علاوہ سید پلی' چندا پیٹ' علی باغ اوڈیکمیٹ' حیدر گوڑہ کے علاقے اس کی جاگیر میں شامل تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جہاں آج عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہے جو کسی ہندوستانی زبان یعنی اُردو ذریعۂ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی تھی۔ وہ علاقہ بھی اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ماہ لقا بائی چندا کی جاگیر کا ہی حصہ تھا۔ ایسی پہلو دار شخصیت کی زندگی کے رنگا رنگ تناظر میں جناب تمکین کاظمی نے "صورت گرانِ دکن" میں صحیح لکھا ہے کہ:

" چندا کی تمام عمر بڑے طمطراق سے گزری پیدا ہونے کے بعد سے وزیروں اور امیروں کی گود میں کھیلتی رہی اور امرائے دکن ہی نے اسے قبر میں اتارا۔ یہ اعزاز اس سے پہلے یا بعد اور کسی شاعرہ یا مغنیہ کو نہ مل سکا۔"

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامینِ نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں ـــــ اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

ـــــ ادارہ

سیّد قدرت نقوی
R-۴۰۱، سیکٹر ۱۵-A-۱، بفرزون،
شمالی کراچی ۳۶ (پاکستان)

پنچ کھنیا دوہے

اُردو شاعری میں حمد، نعت اور منقبت کی صنف اپنی محدود حدوں کے باعث طائرِ فکر کے پر قلم کر دیا کرتی ہے، لیکن محدود امکانات کے باوجود اُردو شعرا نے حسبِ استطاعت مذکورہ اصناف میں نئے جہان دریافت کرنے میں کامیابیاں حاصل کی ہیں ـــــ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کے مطابق: "سید قدرت نقوی کے دوہے اپنی امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں، انھوں نے شیخ شرف الدّین احمد یحییٰ منیری کے دوہوں کی طرح منڈک یا پنچ کھنیا دوہے بھی کہے ہیں۔ منڈک کے اصطلاحی معنی گیت کے ایک ٹکڑے کے ہیں اور پنچ کھنیا کا مطلب ہے پانچ ٹکڑوں والا، لہٰذا وہ پانچ کھنیا دوہا کہلاتا ہے، جس کے چاروں ٹکڑوں کے بعد ایک پانچواں ٹکڑا چوتھے ٹکڑے کے ہم وزن اور ہم قافیہ مستزاد کر دیا جائے۔ سید قدرت نقوی کے مستزاد دوہے کو جدید اُردو شاعری میں دوہے کا نیا تجربہ سمجھنا چاہیے۔"

ذیل کے پنچ کھنیا دوہے سید قدرت نقوی نے حمد اور نعت و منقبت کے محدود دائرے میں کہے ہیں۔ "ایوانِ اُردو" اس نوع کے تجربات کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ـــــ ادارہ

حمد

اللہ، قادر، سبحان ؛ پربھو پالن ہار
دو جگ پوجن ہارا ؛ جگ کا سرجن ہار
وہ مالک کرتار

رب اکبر، سلطان ؛ رحمٰن اور غفّار
للہ حاضر ناظر ہے ؛ ظاہر ہر آثار
جلووں کا انبار

ہ ہے قاہر، قہار ؛ جابر اور جبّار
ادل، منصف، ستّار ؛ غافر اور غفّار
رہبر اور سردار

رشے کا وہ مسجود ؛ خالق اور معبود
ت نہ اس کی محدود ؛ وہ ہر جا موجود
ہر ایک کا مقصود

طن بھی وہ ظاہر بھی ؛ منظہر بھی مظاہر بھی
لوے ظاہر ہر آن ؛ منظر بھی مناظر بھی
منظور بھی، ناظر بھی

اللہ، اکبر اور کبیر ؛ جگ ہے اس کا فقیر
معبود ہے رب کبار ؛ دو عالم کا بیر
من موہن، من دھیر

اللہ، مالک ہے مولا ؛ جگ کے من کا دھیر
مرجع، پیر و مرشد کا ؛ رشیوں سوچ بھیر
ماتھے چھاپ لکیر

شاہوں کا شہ اللہ ہے ؛ بخشے تاج سر پر
پیروں، ولیوں کا مان ؛ رشیوں چھاپ لکیر
وہ ہے ربِ قدیر

○

نعت و منقبت

احمد، مرسلِ برحق ہے ؛ مذہب کا مختار
پیغمبر اور ہادی ہے ؛ دو جگ کا آدھار
کُل جگ کا سردار

نامِ محمد، جگ تارا ؛ من پائیں اجیار
اس نام کے صدقے میں ؛ جگ کا بیڑا پار
میں جاؤں بلہار

حیدر، زہرا، حسنین ؛ اللہ، احمد پیارے
دین کا جھنڈا لہرائیں ؛ ستونت، ستیارے
حق کے پوجن ہارے

مولا علی، سب مولائی ؛ زہرا سب کی مائی
حسنین، سخی، سردار ؛ حق پر جان گنوائی
کیسی پائی بڑائی

آقا میرا حیدر ہے ؛ ولیوں کا سردار
جنّت دوزخ کا مالک ہے ؛ کوثر کا مختار
اللہ کا دل دار

مولا، حیدر، کرار ؛ جودھا، بیری مار
حامی اور مددگار ؛ سیوک سب سنسار
نامِ علی ہتھیار

م بارک پوری

کورے کاغذ پر بے ترتیب لکیریں

میں صدر میں کھڑا بس کا انتظار کر رہا
بسوں اور ویگنوں کی قطار لگی ہوئی تھی سب
الگ الگ راستے تھے۔ سینکڑوں لوگ بسوں
اڈے پر کھڑے تھے۔

بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ
ل رہا تھا۔ دو پہاڑیوں کے دامن میں شام
اعوں کے لیے ہاتھوں میں انگارے لیے نظر
ہی تھی۔ سردی شباب پر تھی۔ صدر میں لوگوں
دہام تھا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔
میں روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ
پٹھان گرم کپڑے بیچ رہے تھے۔ ٹھیلوں اور
پاتھ پر طرح طرح کی چیزیں فروخت
نے والے اور پھل والے آوازیں لگا رہے
سردی میں بھی لوگ قلفی اور آئس کریم سے
ق فرما رہے تھے۔ صدر کے چوراہے پر تین
ف اور برج بنا ہوا تھا جسے بہت کم لوگ
عمال کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ سڑک
ر کے آجا رہے تھے۔ اس ہماہمی کے باوجود
چی کی رعنائیاں دھندلکوں میں گم ہو گئی تھیں۔

اچانک میری 2D بس آ گئی جو ناظم آباد
ر گلبرگ جاتی تھی۔ مسافروں کا ایک غول گیٹ
ٹوٹ پڑا۔ میں بھی بھیڑ میں شامل تھا۔ کنڈکٹر
ر رہا تھا "گورومندر، ناظم آباد، سمن آباد..."

میں نے جیسے ہی بس کے پائدان پر قدم
ا، پیچھے سے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ
ا۔ بس پر چڑھتے چڑھتے میں نے مڑ کر دیکھا تو

توصیف کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں ٹکرائیں۔ میرے احساس کے آئینے میں سن سے کوندے لپکے۔ میرے دل پر اس کے تبسم سے یادیں یوں جھلملا اٹھیں جیسے مندر میں چراغ روشن ہوں۔

"توصیف تم!" بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ میں بس پر سوار ہو چکا تھا۔ وہ بھی ہمسفر تھا۔ یادوں کی جھیل میں دو کنول تیر رہے تھے۔

"ہاں یار! اللہ کا شکر ہے کہ اتنے برسوں کے بعد تمہارا دیدار ہوا۔ کب آئے؟" اس پر اچانک جیسے خوشبوؤں کی بارش ہو گئی ہو۔

"دو ہفتے قبل آیا ہوں۔ ناظم آباد میں ہمشیرہ کے گھر قیام ہے۔"

ہم دونوں کو ایک ہی سیٹ پر جگہ ملی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر دو منچلے نوجوان براجمان تھے ان کی سامنے والی سیٹ پر شال اوڑھے دو پٹھان بیٹھے تھے۔ مسافروں میں مہاجر پٹھان سبھی شامل تھے سیٹیں بھرنے کے بعد لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ بس لوگوں سے ٹھساٹھس بھر گئی تھی۔ اب بس بندر روڈ ہوتی ہوئی گورومندر کی طرف چل پڑی۔ کئی جگہ رکی، چند مسافر اترے، چند سوار ہوئے۔

"کیا حال ہے؟ بھابھی اور کاشف کیسے ہیں؟" میں نے بیتابی سے پوچھا۔ بس کے اندر لوگوں کی گفتگو سے مکھی جیسی بھنبھناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

"سب خیریت ہے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک سولہ سال کے بعد تم سے ملاقات ہو گی" وہ یادوں کی قندیلیں روشن کرنے لگا۔

"ہاں! اکیس سال کے بعد کراچی آیا ہوں۔ تمہاری رہائش کہاں ہے؟" میں بے قراری سے چند منٹوں میں تمام حالات جاننے کا متمنی تھا۔

"گلبرگ کے آخری بس اسٹاپ کے پاس رہتا ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ" اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر دیا۔ "میرے گھر کا پتہ درج ہے۔"

"تم تو مشرقی پاکستان میں رہ گئے تھے۔ اب وہاں کیا حال ہے؟ تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟"

"یوں سمجھ لو کہ تیرگی میں اجالا ہوا تو کیا؟" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "کرفیو کا وقت قریب ہے، اس لیے تمہارے ساتھ جا نہیں سکتا۔"

"ہاں ان دنوں کراچی دوسرا بیروت بنا ہوا ہے۔ دن میں کرفیو نہیں ہوتا۔ کل جمعہ ہے چھٹی کا دن ہے، اگر تم گلبرگ آ گئے تو تم سے ملاقات ہو جائے گی، بصورت دیگر میں تمہارے پاس آ جاتا ہوں۔" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ جیسے اسے ہماری جدائی کچوکے لگا رہی ہو۔

"میں کل دوپہر اپنے کزن سے ملنے سمن آباد جاؤں گا۔ نماز کے بعد تم سے ملنے آؤں گا۔" اتنے عرصے کے بعد بھی ہم صرف چند لمحوں کے لیے ملے تھے۔ اس ملن میں خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ ہمارے درمیان حالات کی فصیل

پکچر پیلس، کھلنا (بنگلہ دیش)

ید قدرت نقوی
- ۴۰۱، سیکٹر ۱۵-A - ۱، بفرزون،
ی کراچی ۳۶ (پاکستان)

پنچ کھنیا دوہے

اُردو شاعری میں حمد، نعت اور منقبت کی صنف اپنی محدود حدوں کے باعث طائر فکر کے پر قلم کر دیا کرتی ہے، لیکن محدود امکانات کے باوجود اُردو شعرا نے حسبِ استطاعت مذکورہ اصناف میں نئے جہان دریافت کرنے میں کامیابیاں حاصل کی ہیں ــــــ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کے مطابق: "سید قدرت نقوی کے دوہے اپنی امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں، انھوں نے شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے دوہوں کی طرح مٹڈک یا پنچ کھنیا دوہے بھی کہے ہیں. مٹڈک کے اصطلاحی معنی گیت کے ایک ٹکڑے کے ہیں اور پنچ کھنیا کا مطلب ہے پانچ ٹکڑوں والا، لہٰذا وہ پانچ کھنیا دوہا کہلاتا ہے، جس کے چاروں ٹکڑوں کے بعد ایک پانچواں ٹکڑا چوتھے ٹکڑے کے ہم وزن اور ہم قافیہ مستزاد کر دیا جائے. سید قدرت نقوی کے مستزاد دوہے کو جدید اُردو شاعری میں دوہے کا نیا تجربہ سمجھنا چاہیے۔"

ذیل کے پنچ کھنیا دوہے سید قدرت نقوی نے حمد اور نعت و منقبت کے محدود دائرے میں کہے ہیں۔ "ایوانِ اُردو" اس نوع کے تجربات کا خیر مقدم کرتا ہے۔

ــــــ ادارہ

حمد

ـد، قادر، سبحان؛ پربھو پالن ہار
جگ پوجن ہارا؛ جگ کا سرجن ہار
وہ مالک کرتار

ـب اکبر، سلطان؛ رحمٰن اور غفار
ـر حاضر ناظر ہے؛ ظاہر ہر آثار
جلوؤں کا انبار

ـے قاہر، قہار؛ جابر اور جبار
ـل، منصف، ستار؛ غافر اور غفار
رہبر اور سردار

ـشے کا وہ مسجود؛ خالق اور معبود
ـت نہ اس کی محدود؛ وہ ہر جا موجود
ہر ایک کا مقصود

ـن بھی وہ ظاہر بھی؛ مظہر بھی مظاہر بھی
ـے ظاہر ہر آن؛ منظر بھی مناظر بھی
منظور بھی، ناظر بھی

اللہ، اکبر اور کبیر؛ جگ ہے اس کا فقیر
معبود ہے رب کبار؛ دو عالم کا بیر
من موہن، من دھیر

اللہ، مالک ہے مولا؛ جگ کے من کا دھیر
مرجع، پیر و مرشد کا؛ رشیوں سوچ بھیر
ماتھے چھاپ لکیر

شاہوں کا شہ اللہ ہے؛ بخشے تاج سریر
پیروں، ولیوں کا مان؛ رشیوں چھاپ لکیر
وہ ہے ربِ قدیر

○

نعت و منقبت

احمد، مرسلِ برحق ہے؛ مذہب کا مختار
پیغمبر اور ہادی ہے؛ دو جگ کا آدھار
کُل جگ کا سردار

نامِ محمد، جگ تارا؛ من پائیں اجیار
اس نام کے صدقے میں؛ جگ کا بیڑا پار
میں جاؤں بلہار

حیدر، زہرا، حسنین؛ اللہ، احمد پیارے
دین کا جھنڈا لہرائیں؛ ستونت ستیارے
حق کے پوجن ہارے

مولا علی، سب مولائی؛ زہرا سب کی مائی
حسنین، سخی، سردار؛ حق پر جان گنوائی
کیسی پائی بڑائی

آقا میرا حیدر ہے؛ ولیوں کا سردار
جنت دوزخ کا مالک ہے؛ کوثر کا مختار
اللہ کا دل دار

مولا، حیدر، کرار؛ جودھا، بیری مار
حامی اور مددگار؛ سیوک سب سنسار
نامِ علی ہتھیار

نام بارک پوری

کورے کاغذ پر بے ترتیب لکیریں

میں صدر میں کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ بسوں اور ویگنوں کی قطار لگی ہوئی تھی سب کے الگ الگ راستے تھے۔ سینکڑوں لوگ بسوں کے اڈے پر کھڑے تھے۔

بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ چھلک رہا تھا۔ دو پہاڑیوں کے دامن میں شام شعاعوں کے لیے ہاتھوں میں انگارے لیے نظر آ رہی تھی۔ سردی شباب پر تھی۔ صدر میں لوگوں کا اژدہام تھا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ دکانیں روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر پٹھان گرم کپڑے بیچ رہے تھے۔ ٹھیلوں اور فٹ پاتھ پر طرح طرح کی چیزیں فروخت کرنے والے اور پھل والے آوازیں لگا رہے تھے۔ سردی میں بھی لوگ قلفی اور آئس کریم سے شوق فرما رہے تھے۔ صدر کے چوراہے پر تین طرف اوور برج بنا ہوا تھا جسے بہت کم لوگ استعمال کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ سڑک پار کر کے آ جا رہے تھے۔ اس ہما ہمی کے باوجود کراچی کی رعنائیاں دھندلکوں میں گم ہو گئی تھیں۔

اچانک میری D 2 بس آ گئی جو ناظم آباد ہو کر گلبرگ جاتی تھی۔ مسافروں کا ایک غول گیٹ پر ٹوٹ پڑا۔ میں بھی بھیڑ میں شامل تھا۔ کنڈکٹر چیخ رہا تھا۔ "گورو مندر، ناظم آباد، سمن آباد..."

میں نے جیسے ہی بس کے پائدان پر قدم رکھا، پیچھے سے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ بس پر چڑھتے چڑھتے میں نے مڑ کر دیکھا تو توصیف کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں ٹکرائیں۔ میرے احساس کے آئینے میں سن سے کوندے لپکے۔ میرے دل پر اس کے تبسم سے یادیں یوں جھلملا اٹھیں جیسے مندر میں چراغ روشن ہوں۔

"توصیف تم!" بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ میں بس پر سوار ہو چکا تھا۔ وہ بھی ہمسفر تھا۔ یادوں کی جھیل میں دو کنول تیر رہے تھے۔

"ہاں یار! اللہ کا شکر ہے کہ اتنے برسوں کے بعد تمہارا دیدار ہوا۔ کب آئے؟" اس پر اچانک جیسے خوشیوں کی بارش ہو گئی ہو۔

"دو ہفتے قبل آیا ہوں۔ ناظم آباد میں ہمشیرہ کے گھر قیام ہے۔"

ہم دونوں کو ایک ہی سیٹ پر جگہ ملی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر دو منچلے نوجوان براجمان تھے۔ اُن کی سامنے والی سیٹ پر شال اوڑھے دو پٹھان بیٹھے تھے۔ مسافروں میں مہاجر پٹھان سبھی شامل تھے۔ سیٹیں بھرنے کے بعد لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ بس لوگوں سے ٹھسا ٹھس بھر گئی تھی۔ اب بس بندر روڈ ہوتی ہوئی گورو مندر کی طرف چل پڑی۔ کئی جگہ رُکی، چند مسافر اُترے، چند سوار ہوئے۔

"کیا حال ہے؟ بھابھی اور کاشف کیسے ہیں؟" میں نے بیتابی سے پوچھا۔ بس کے اندر لوگوں کی گفتگو سے مکھی جیسی بھنبھناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

"سب خیریت ہے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک سولہ سال کے بعد تم سے ملاقات ہو گی۔" وہ یادوں کی قندیلیں روشن کرنے لگا۔

"ہاں! اکیس سال کے بعد کراچی آیا ہوں۔ تمہاری رہائش کہاں ہے؟" میں بے قراری سے چند منٹوں میں تمام حالات جاننے کا متمنی تھا۔

"گلبرگ کے آخری بس اسٹاپ کے پاس رہتا ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ۔" اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر دیا۔ "میرے گھر کا پتہ درج ہے۔"

"تم تو مشرقی پاکستان میں رہ گئے تھے۔ اب وہاں کیا حال ہے؟ تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟"

"یوں سمجھ لو کہ تیرگی میں اُجالا ہوا تو کیا؟" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "کرفیو کا وقت قریب ہے، اس لیے تمہارے ساتھ جا نہیں سکتا۔"

"ہاں اِن دنوں کراچی دوسرا بیروت بنا ہوا ہے۔ دن میں کرفیو نہیں ہوتا۔ کل جمعہ ہے چھٹی کا دِن ہے، اگر تم گلبرگ آ سکو تو سب سے ملاقات ہو جائے گی، بصورت دیگر میں تمہارے پاس آ جاتا ہوں۔" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ جیسے اُسے ہماری جدائی پچھو کے لگا رہی ہو۔

"میں کل دوپہر اپنے کزن سے ملنے سمن آباد جاؤں گا۔ نماز کے بعد تم سے ملنے آؤں گا۔" اتنے عرصے کے بعد بھی ہم صرف چند لمحوں کے لیے ملے تھے۔ اس ملن میں خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ ہمارے درمیان حالات کی فصیل

پکچر پیلس، کھلنا (بنگلہ دیش)

حائل ہوگئی تھی۔ سات بجے سے ناظم آباد میں کرفیو نافذ ہو جاتا تھا۔

کنڈکٹر نے ٹکٹ مانگا۔ توصیف نے جھٹ سے دس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پٹھان اور مہاجر فساد سے سارا کراچی متاثر ہوا تھا۔ شہر کے مختلف علاقوں میں خون، آگ، اور دھوئیں کا کھیل جاری تھا۔ فوج ٹرکوں پر سوار سڑکوں پر گشت کر رہی تھی۔ شہر میں کشیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہر چہرے پر خوف وہراس طاری تھا۔ دن میں کرفیو اٹھا لیا جاتا۔ مگر رات کی تاریکی پھیلنے کے ساتھ ساتھ کرفیو نافذ کر دیا جاتا، لوگ سرِ شام اپنے اپنے کاروبار اور دفتروں سے فوراً گھروں کو واپسی میں عافیت سمجھتے تھے۔ ہر آدمی خوف زدہ تھا کہ نہ معلوم کل کی صبح اپنے ساتھ کیا پیغام لائے؟ کراچی جسے رات کی دلہن کہا جاتا تھا اُس کی مانگ میں سیندور کی بجائے خون کی لالی شامل ہوگئی تھی۔

مہاجر اور پٹھان علاقے الگ الگ بسے ہوئے تھے۔ پٹھانوں کے علاقے میں مہاجر جانے سے گریز کرتے اور مہاجروں کے علاقے میں پٹھان جانے سے گھبراتے تھے دونوں طرف کشمکش اور بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔

جس دن پٹھانوں نے پہاڑیوں سے اورنگی ٹاؤن پر شب خون مارا تھا، ہر علاقہ ماتم کدہ بن گیا تھا۔ چہروں پر تفکر کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ افواہیں گردش کر رہی تھی ہر شخص تحفظ اور سکون کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

ہمارے سامنے والی سیٹ کے دونوں لڑکوں نے سرگوشیاں کیں، پھر ایک نے کہا۔ "تمھارے پاس ماچس ہے؟"

"میری جیب میں پڑی ہے" دوسرے نے معنی خیز نظروں سے سامنے والی سیٹ کے پٹھانوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جلاؤ گے، تاکہ سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے" پہلے لڑکے نے استعاراتی انداز میں طنز کیا۔

دونوں پٹھان اپنی سیٹ پر گم صم بیٹھے ہوئے تھے۔ بس کے ماحول میں شہر خموشاں جیسی خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ سب کے منہ میں تالے پڑے ہوئے تھے۔ جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

میں نے توصیف کے کان کے پاس منہ لے جاکر آہستہ سے کہا "یہاں بھی ہماری بنگالی جیسے سنگین حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ جو ہم بنگلہ دیش میں بھگت رہے ہیں"

"ہاں یار! آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا" اس نے تاسف سے کہا "ہندوستان میں ہندو مسلم فساد، بنگلہ دیش میں بہاری، بنگالی رقابت اور کراچی میں مہاجر، پٹھان اور سندھی میں تناؤ"

اب بس پٹیل پاڑہ کے قریب پہنچنے لگی تھی۔ دونوں لڑکوں نے چپ سادھ لی تھی۔ پٹیل پاڑہ میں زیادہ تر پٹھانوں کی آبادی تھی۔ گویا آندھیوں کے شب خون سے ہر چہرہ لہولہان تھا۔ کوئی شخص کسی سے بھی ہم کلام نہ تھا۔ جیسے وہ جادو سے بت بنا دیے گئے ہوں۔ اس وقت پٹھان آپس میں زور زور سے پشتو میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے لہجے میں تلخی اور آنکھوں میں بیزاری تھی۔ بس اسٹاپ پر رکی۔ سامنے والی سیٹ کے دونوں پٹھان اتر پڑے۔ بس دوبارہ حرکت میں آئی تو چہروں پر طمانیت نظر آنے لگی۔

چورنگی کے بس اسٹاپ پر بہت لوگ اتر پڑے۔ صرف چند مسافر سوار دونوں لڑکے جنھوں نے چپ سادھ رکھ پھر ان کی گفتگو میں تیزی آگئی تھی۔ ہر شخص شبہ میں مبتلا تھا۔ بس "سخی حسن" ہوتی چلی جاتی تھی۔ وہاں سہراب گوٹھ کے علا پٹھانوں کی آبادی تھی۔ سارا شہر دہشت لپیٹ میں تھا۔

اب بس پٹرول پمپ کے نزدیک والی تھی۔ مجھے اس چوراہے پر اتر کر ناظم داخل ہونا تھا۔

"توصیف میں اگلے بس اسٹاپ جاؤں گا" میں نے گرم جوشی سے اس ملایا۔

"ہماری ملاقات ادھوری رہی کل اطمینان سے گفتگو ہوگی۔ آنا نہ بھولنا، شدت سے انتظار کروں گا" یہ کہتے کا گلا رندھ گیا۔ ہم دونوں حالات کے میں محبوس ہو گئے تھے۔

کئی لوگ اترنے کے لیے گیٹ کھڑے ہو گئے تھے۔ میں بھی ان کے سا تھا۔ زندگی کے چوراہے پر اچانک ملنے بچھڑنے کا قلق تھا۔

پٹرول پمپ اسٹاپ پر بس رک نے ہاتھ کے اشارے سے توصیف کو خ کہا اور بس سے اتر پڑا۔ بس مسافروں چل پڑی۔ وہ رفیق جو میرا ہم سفر تھا، جاتی ہوئی بس میں میری نظروں سے اوجھ چکا تھا۔ سڑکیں سنسان ہونی شروع ہو تھیں۔ کرفیو کا وقت قریب تھا۔ دکانوں دروازے بند کیے جا رہے تھے۔ میں یاد

خوشبو سے سرشار گھر واپس آیا۔
ڈرائنگ روم میں بیٹھا، بھانجے اور بھانجیوں سے گپ شپ کرتا رہا۔ پھر ٹی۔ وی پر "نیلام گھر" پروگرام دیکھا۔
رات کا کھانا کھانے کے بعد بستر پر یادوں کی چادر تان کر لیٹ گیا۔ میری زندگی کے ورق اُلٹنے لگے۔ نظروں کے سامنے سے پردے ہٹنے لگے۔ میرے ذہن کے آئینے میں توصیف کا چھپا ہوا چہرہ واضح ہونے لگا۔
توصیف نے اور میں نے انٹرمیجیٹ تک تعلیم ایک ساتھ حاصل کی تھی۔ پھر میں مزید تعلیم کے لیے لاہور چلا گیا۔ اس نے ڈھاکا سے بی۔ اے پاس کیا۔ میں ۱۹۷۷ء کے آخر میں مشرقی پاکستان واپس آگیا۔ وہ گریجویشن کرنے کے بعد ڈھاکا میں ایک میڈیکل فرم میں ملازم ہو گیا تھا۔ تنخواہ معقول تھی۔ اس کی رہائش محمد پور میں تھی۔ میں اقبال روڈ کے مکان میں رہتا تھا۔
جب میں لاہور میں تھا تو اس نے ریشماں سے شادی کرلی تھی۔ بنگال کے تیکھے نقوش کی ریشماں کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ توصیف شام کو فرانسیسی پڑھنے جایا کرتا تھا۔ وہاں ریشماں بھی فرانسیسی زبان سیکھنے آتی تھی۔ دونوں میں مراسم بڑھے۔ قربت پیدا ہوئی۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں پسندیدگی کا چراغ روشن ہوا۔ ریشماں نے اپنے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود توصیف سے شادی کرلی۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت ہی خوشگوار اور پُر سکون گزر رہی تھی۔
میں جب بھی اپنے کام سے فارغ ہوکر گھر واپس آتا، منہ ہاتھ دھوکر، کچھ آرام کرنے کے بعد ان سے ملنے چلا جاتا۔
دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دل وجان سے چاہتے تھے۔ ریشماں نے میٹرک اور انٹرمیجیٹ میں اُردو مضمون لیا تھا۔ اس لیے اُسے اُردو بولنے میں دقّت نہیں ہوتی تھی۔ ویسے تو آتی ہے اردو زبان آتے آتے گھر میں نوکر نوکرانی سے بنگلہ میں گفتگو کرتی تھی۔
ان کے آنگن میں خوابوں کا پھول کھلنے والا تھا۔ اس لیے دونوں مسرت و شادمانی کے جھولے میں جھول رہے تھے۔
ایک رات چاند جب آسمان پر بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ میں ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو دونوں میاں بیوی میں نوک جھونک ہو رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی دونوں ایک ساتھ بول پڑے۔
"ہمارا معاملہ آپ سلجھائیں۔"
"ٹھیک ہے۔ مدعا علیہ اور استغاثہ اپنا اپنا مقدمہ میرے حضور میں پیش کریں۔" میں نے جج کے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔
"میں بہت دیر سے ریشماں کو سمجھا رہا ہوں کہ میرا بیٹا اسکول میں اُردو پڑھے گا۔"
"میں ماں ہوں۔ کیا مجھے اپنے لڑکے پر کوئی حق نہیں۔ ماں کے ناتے مادری زبان بنگلہ ہوگی۔ یہاں کے عوام کی زبان اُردو نہیں ہے، بنگلہ زبان اس کے روشن مستقبل کی ضمانت ہوگی۔"
"قائداعظم کی زبان بھی اُردو نہیں تھی مگر انھوں نے ملک اور قوم کی بھلائی اسی میں دیکھی چنانچہ اُردو قومی زبان قرار دی گئی۔"
"واہ، واہ! ساڑھے سات کروڑ آبادی کی زبان بنگلہ ہے۔ ہمارا ثقافتی سرمایہ بنگلہ میں ہے۔ کسی قوم کو مارنا ہو تو اس کی زبان چھین لو۔"
"اچھا یہ بتاؤ۔ میں تمہارا مجازی خدا ہوں۔ تم مجھ سے اُردو میں گفتگو کرتی ہو یا نہیں؟" توصیف نے سوال اُٹھایا۔
"ہاں!" وہ سوچ میں پڑ گئی۔
"جب باپ سے اردو میں گفتگو کرو گی تو بیٹے سے کس زبان میں بات کرو گی؟"
"اگر تمھاری ضد ہے تو دوسری بات ہے" اس نے معاملہ رفع دفع کرنے کے انداز میں کہا۔
"ایسا کیوں نہ کریں کہ بچے کو دونوں زبانیں پڑھائیں"
"ارے بھئی۔ پہلے نئے مہمان کو آنے تو دیجئے پھر ذریعۂ تعلیم کی بات ہوگی"۔ میں نے معاملے کو رفع دفع کرنے کو کہا۔ "بچے کو انگلش میں بھی تعلیم دلوائی جا سکتی ہے۔ زبان کا مسئلہ آپ لوگوں کا اپنا ہے۔ بہت سارے لوگ دوسرے ممالک سے شادی کر کے خاتون لاتے ہیں مگر انھیں کبھی زبان کا مسئلہ درپیش نہ ہوا۔ اور نہ ہی زبان سے کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ ازدواجی زندگی بیڑ کی مانند ہے جس کی چھاؤں میں بال بچے پروان چڑھتے ہیں۔"
اکثر میاں بیوی میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی، مگر کبھی ان کی چاہت میں کمی نہیں آئی۔ ان کی بیاہتا زندگی بہت ہی خوشگوار اور اطمینان بخش تھی۔ میری حیثیت گھر کے ایک فرد کی ہوگئی تھی۔ وہ ہر بات کا مشورہ مجھ سے کرتے تھے۔ آخر خوشیوں کی وہ گھڑی بھی آن پہنچی۔ ریشماں کی گود میں گڈے جیسا بیٹا قلقاریاں مارنے لگا۔ انھوں نے اس کا نام "کاشف" رکھا۔
شب و روز گزرتے رہے مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات دگرگوں ہوتے گئے۔ جس سرزمین میں بھٹیالی گیت اور فضا میں بانسری کی لے بکھری رہتی تھی، وہاں بارود کی بُو پھیلنے لگی۔ کاشف تین سال کا ہو گیا تھا مگر وہ "غوں غاں" کے سوا کچھ نہ بول سکتا تھا۔ توصیف اور

ماں کے چہرے پر غم کے بادل منڈلا رہے ہے۔
رے ان کا ذہن پراگندہ تھا۔ نواُمیدی کے
ندمیں احساسات کے جگنو غلطاں تھے۔

توصیف اکثر کھویا کھویا سا رہنے لگا۔
نف ایسا غنچہ تھا جو چٹکنے سے پہلے گویائی کی
شبو سے محروم رہ گیا۔ انھیں اندیشے نے گھیر رکھا
اکہ بچہ گونگا ہے۔ میں نے انھیں دلاسا دیا اور
کے ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔
س نے کاشف کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ گلے
ایکسرے لیا۔ کئی قسم کے ٹسٹ کیے، مگر قوتِ
یائی کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر رہا۔
وہ توتلا بھی ہوتا تو توصیف اور ریشماں اپنے
نے پر صبر کی سل رکھ لیتے۔ بھول سے کاشف پر
ر پڑتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے ساون
بدلیوں سے نمی نچوڑ لی ہو۔

مارچ ۱۷ء کے بعد مشرقی پاکستان میں
ب بھڑک اُٹھی۔ ہر شخص اپنے بال بچوں کی جان
ستقبل کی فکر میں تھا۔ توصیف ــــ ریشماں
کاشف کے ساتھ کراچی چلا گیا۔ اس کے بعد
رے اور ان کے درمیان رابطہ نہ رہا۔ جب
ب کا ایک بازو کٹ گیا تو تعلقات کی زنجیریں
ں کٹ گئیں۔ ان کی یادوں کی کسک سے بارہا
ھیں بھر آئیں۔ اب سولہ سال کے بعد ملاقات
نے برتیتی ہوئی یادوں کے کھنڈر میں آشنا
روں کے چراغ جل اُٹھے۔

دوسرے دن جب ناظم آباد سے کمن آباد
نے کے لیے رکشا پر سوار ہونا چاہا تو پٹھان
یئور نے جانے سے انکار کر دیا۔ مسلسل کئی
ں سے لالوکھیت میں غیر معینہ مدت کے لیے
فیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے دوسرا
ملا۔ پہلے کزن سے ملاقات کی پھر ڈھائی بجے

گلبرگ بس اسٹینڈ کے پیچھے توصیف سے ملنے روانہ ہوا۔ مکان تلاش کرنے میں زحمت نہیں ہوئی۔ گھنٹی بجاتے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ مجھ سے بغلگیر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میں نے مٹھائی کا ڈبہ میز پر رکھ دیا۔

ہم دونوں صوفے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

" مکان تلاش کرنے میں زحمت تو نہیں ہوئی ؟"

" نہیں"۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

" بھابی اور کاشف کہاں ہیں ؟"

" ریشماں تمھارے آنے کی خبر سن کر باورچی خانے میں گھسی ہوئی ہے۔ کاشف قریب کے میدان میں کرکٹ کھیل رہا ہے، اسی وقت اس کی آمد متوقع ہے۔ اس کے علاوہ تمھیں دو اور نفوس کا علم نہیں جو اس دنیا میں تشریف لا چکے ہیں۔"

" کیا مطلب ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

" بھئی! اللہ تعالیٰ نے کراچی آنے کے بعد ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ بیٹے کا نام خاور اور بیٹی کا نام یاسمین ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

" کراچی آنے کے بعد تمھیں کن حالات کا سامنا کرنا پڑا ؟" میں نے پوچھا۔

" نئی جگہ، نئے لوگ شروع میں سخت تنگ و دو کی زندگی گزاری، جس کمپنی میں بحیثیت کلرک نوکری کر رہا تھا۔ اب ترقی کر کے سینئر افسر بن گیا ہوں۔ اپنا مکان بھی بنوا لیا ہے۔"

عین اسی وقت ریشماں ٹرالی میں انواع و اقسام کے پکوان لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی

اس کے پیچھے سات آٹھ برس کی ایک بچی تھی۔ یہ یاسمین تھی۔ ریشماں کی شکل و شباہت میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا، صرف ان کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ اب تو وہ روانی سے اردو بولنے لگی تھیں۔

" اتنے برسوں سے آپ نے ہماری کوئی خبر نہیں لی"۔ بھابی نے گلے شکوے شروع کر دیے۔ یاسمین میرے ساتھ آکر بیٹھ گئی کچھ جھجک اور شرم کے ساتھ۔

" آپ کو خبر نہیں کہ ہمیں کس آگ کے دریا سے ہو کر گزرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے کشتیِ حیات منجھدار سے نکل کر ساحل سے لگی ہے"۔ میں نے مختصر الفاظ میں بنگلہ دیش کے حالات بتائے۔

" آپ کے گھر والے . . ." بھابھی کی پلکیں نم آلود تھیں۔

" اللہ کے فضل سے بخیریت ہیں، اسی لیے میں نے موقع غنیمت سمجھ کر کراچی کا چکر لگایا۔ میں کاشف کی خیریت معلوم کرنے کو بے چین تھا۔

تینوں بچے کیا کر رہے ہیں ؟"

" خاور آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ یاسمین تیسری جماعت کی طالبہ ہے۔ اور کاشف کی قوتِ گویائی . . ." توصیف کہتے کہتے رُک گیا۔

" اسے کیا ہوا ؟" میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے ایک لمحہ سوچا پھر حکایت سنانے کے لیے اپنی یادداشت کی لو تیز کی۔

" یہاں آنے کے بعد میں کاشف کی طرف سے دل برداشتہ ہو گیا۔ بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر کراچی کے مشہور ماہرِ نفسیات نے تشخیص کی کہ پیدائش کے بعد بچے کا ذہن کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔ یکایک

دوزبانوں کی کشمکش سے کاشف کا ذہن الجھنوں کا شکار ہو گیا ہے۔ اچانک دو زبانیں اس کے ذہن سے ٹکرائی ہیں۔ اس کی گویائی تذبذب کے دائرے میں محصور ہو گئی اور تحت الشعور کے آخری خانے میں ذہنی رو کسی گتھی میں اُلجھ کر رہ گئی۔ بچے کا ذہن ہچکچاہٹ کے بھنور میں گردش کر رہا ہے۔ چنانچہ سائیکوٹکس نے نفسیاتی طریقے سے اس کے لاشعور کی گتھی کو سلجھانے کی ترکیب بتائی۔ اس کے بعد ہم موہوم منزل کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔

کاشف محلّے کے بچوں کے ساتھ آزادی سے کھیلنے کودنے لگا۔ گھر میں گفتگو کے دوران اس کی ذہنی بالیدگی کا خاص خیال رکھا جاتا۔ اس کے کسی بھی کام میں اڑچن نہ ڈالی جاتی۔ نفسیاتی طریقۂ علاج سے اس میں خود اعتمادی پیدا کی گئی۔ رفتہ رفتہ اس کی قوتِ گویائی کے تار بجنے لگے، پھر اُسے اسکول میں داخل کرادیا، وہ جلد ہی ہم جماعتوں کے ساتھ گھل مل گیا۔ اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بولنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ بالکل نارمل ہو گیا۔ اب نہ صرف عام لڑکوں کی طرح گفتگو کر سکتا ہے بلکہ ہائر سیکنڈری کا طالب علم ہے۔"

کاشف کو قوتِ گویائی مل جانے پر میرا دل ایک انجانی مسرت سے لبریز ہو اُٹھا۔

اچانک باہر کا دروازہ کھلا۔ کاشف اور خاور کمرے میں داخل ہوئے۔ کاشف کرکٹ کے لباس میں خوبصورت اور اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ خاور بھی گورا، چٹّا اور جاذبِ نظر تھا۔ تعارف کے بعد فوراً دونوں مجھ سے گھل مل گئے۔ میں بڑے غور سے کاشف کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ رواں دواں زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں نہایت تعجب سے خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی نے کورے کاغذ پر پڑی بے ترتیب لکیروں کو ربڑ سے مٹا دیا ہو۔

گفتگو کا سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ شام کے سائے پھیلنے لگے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو چھ بج رہے تھے۔ سات بجے ناظم آباد میں کرفیو لگتا تھا۔ ان سے رخصت چاہی تو سب ہی آبدیدہ ہو گئے۔ دوسرے دن اُنھیں ناظم آباد مدعو کیا تو ان کے گلے شکوے کم ہوئے۔

توصیف تینوں بچوں کے ساتھ مجھے بس اسٹینڈ تک چھوڑنے آیا۔ سردی غضب کی پڑ رہی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں جسم میں چبھ رہی تھیں۔

جب بس روانہ ہوئی تو میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر انھیں خدا حافظ کہا۔ بس سنسان سڑک پر برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ سڑکوں کے دورویہ کھمبوں کی لائٹیں دُھند میں اونگھ رہی تھیں بس میں صرف چند مسافر سمٹے سکڑے بیٹھے تھے۔ شک کا بچھو انھیں ڈنک مار رہا تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ خوف کا ناگ اپنی زہریلی زبان لیے سارے شہر میں رینگ رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ کاشف کے ذہن کی گتھیاں تو سلجھ گئی تھیں، مگر ایک شہر کا مقدر تارِ عنکبوت میں جکڑا جا رہا تھا۔

عبدالستار دلوی

اردو، ہندی اور اودھی

(ایک زاویۂ نظر)

اُردو اور ہندی ادبی اور لسانی اعتبار سے ہندوستان کی دو بڑی اور بہت اہم زبانیں ہیں۔ ان کے آغاز اور ارتقا کی کہانی بہت دلچسپ ہے اور اُردو کے تعلق سے کہیں کہیں سے المناک بھی۔ قدامت کے لحاظ سے اردو کو اولیت حاصل ہے جو کھڑی بولی کے روپ میں ترقی کرتی رہی۔ ہندی کے مشہور عالم پنڈت رام چندر شکل نے اپنی مشہور کتاب "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کھڑی بولی اردو کی شکل پہلے بنی اور ہندی کا روپ بعد میں بنا۔ ہندی اور اُردو میں جو مماثلتیں ہیں وہ بہت کم زبانوں کو میسّر ہیں۔ دونوں زبانوں کی قواعدی ساخت یکساں ہے، اسی طرح دونوں زبانوں کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ بھی ایک ہے۔ لیکن اس مماثلت کے باوجود دونوں میں سماجی لسانیات اور اسلوبیاتی حیثیت سے بڑا فرق ہے۔ لہٰذا اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کہنا یا ایک ہی زبان کے دو روپ قرار دینا لسانی بھول ہے۔ اگر توضیحی لسانیات کی بنیاد پر دونوں میں مماثلت ہے تو سماجی لسانیات اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے ان دونوں میں نمایاں فرق بھی ہے۔ لہٰذا لسانیات کی ان دونوں، بلکہ تینوں شاخوں (توضیحی لسانیات، سماجی لسانیات، اور اسلوبیات) کی روشنی میں ان دونوں زبانوں کو آزاد زبانیں ہی سمجھنا چاہیے۔

ان دونوں زبانوں کا تہذیبی اور لسانی پس منظر جداگانہ ہے۔ اُردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے جس میں سنسکرت اور عربی و فارسی کے الفاظ اور ان زبانوں کی خصوصیات اظہار کی قوت اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔ ہندی اپنے تہذیبی اور فکری پس منظر کے لیے سنسکرت کے قدیم لسانی سرمایے سے منسلک ہے۔ اردو ادب اور ہندی ساہتیہ کی روایتیں بھی الگ الگ ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے ادب بھی دراصل دو فکری دھارے ہیں اور خالص اسلوبیاتی اعتبار سے ان دونوں میں نمایاں فرق ہے جس کی وجہ سے ان دونوں کو ایک ہی زبان کے دو اسالیب سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اُردو اور ہندی میں جو مماثلتیں ہیں ان کا احترام کیا جانا چاہیے اور ان دونوں زبانوں میں ادبی سطح پر ابلاغ و ترسیل کے دھارے کو ترجموں کی مدد سے عام کرنا چاہیے۔ اردو کے مقابلے میں ہندی کا ارتقا اٹھارویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوا اور اس کو سمت اور رفتار بھارتیندو ہرش چندر نے عطا کی جو خود ابتداً "رسا" تخلص کے تحت اُردو میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے معاصرین میں ستارۂ ہند راجہ شیو پرشاد بھی تھے جو بھارتیندو کے برخلاف اُردو کے حامی تھے۔

زبان اور بولی کا آپس میں گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ زبان بولی کی ترقی یافتہ (STANDARDISED) صورت ہے اور بولی زبان کی ایک عام پسند شکل ہے جو معیاری زبانوں کے مقابلے میں عام بول چال میں استعمال ہوتی ہے اور وسیع و عریض مختلف لسانی علاقوں میں مخصوص مقامی الفاظ اور لہجے بھی اپنا لیتی ہے۔ زبان اس کے برعکس مرکز اور ادب کی تابع ہوتی ہے۔ زبان اور بولی میں فرق کیفیت کا نہیں بلکہ کمیّت کا فرق ہوتا ہے اور ان میں آپسی افہام و تفہیم کی شکل بنی رہتی ہے، اس کے برعکس دو زبانیں ادبی سطح پر اور افہام و تفہیم (MUTUAL INTELLIGIBILITY) کی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ادبی سطح پر اردو اور دکنی اُردو میں جو رشتہ ہے وہ ادبی روایتوں، دو مماثل فکری دھاروں اور آپسی افہام و تفہیم کا رشتہ ہے۔ اردو کا عام قاری دکنی اردو کی ادبی روایتوں کو سمجھتا ہے اور دونوں کی لفظیات سے عام طور سے واقف ہے، لیکن اگر وہ اودھی، برج بھوجپوری اور میتھلی کے علاقوں سے تعلق نہیں رکھتا تو وہ ان زبانوں کے ادب اور زبانوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا جو لسانی اور ادبی رشتہ اردو اور دکنی میں ہے وہ رشتہ اردو اور اودھی، برج بھوجپوری یا میتھلی میں نہ ہونے کی وجہ سے یہ زبانیں آزادانہ زبانوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں اردو کی بولیوں سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان زبانوں کے ادب کو تاریخ ادب کا حصہ بنایا جاسکتا ہے، البتہ وہ ادبی نمونے جو کھڑی بولی سے مماثلت رکھتے ہوں اُردو کا بھی سرمایہ ہوں گے۔ کبیر اور میرا بائی کے کلام میں کئی ایسے نمونے ہیں جو خالص لسانی نقطۂ نظر سے برج یا راجستھانی کے مقابلے میں کھڑی بولی کے نمونے ہیں اور ایسے نمونے یقیناً اردو کی میراث

شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی۔ ۴۰۰۰۹۸

اور اُنھیں اُردو کی ادبی تاریخ کا حصّہ بننا
ہیے۔
اودھی کی اپنی ایک آزادانہ ادبی روایت
اور اودھی کی اپنی لسانی فضا ہے۔ لہٰذا
طرح اودھی اردو کی بولی نہیں ہے۔ اسی
رح یہ ہندی کی بھی بولی نہیں کہلائی جا سکتی۔
کی بنیادی وجہ ان دونوں کا ادبی سرمایہ بھی
جو ایک دوسرے سے مختلف ہے اور نہ
ہندی اور اودھی میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے
ام و تفہیم کی صورت پائی جاتی ہے جو زبان
بولی کے اعتبار سے دونوں کو ملاتی ہو۔ مولانا
د کی چنداین ہو یا مولانا قطبین کی مرگاوتی
عثمان کی چتراولی، ملک محمد جائسی کی پدماوت
چاہے تلسی داس کی رام چرت مانس، ہندی
ادبی روایت سے میل نہیں کھاتیں اور نہ ہی
بان اور بولی کی بنیادی خصوصیت اور اس کے
شتے کی بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ ہندی
رٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) کے زمانے میں
گریزوں کی سرپرستی میں ترجموں کی صورت میں
روان چڑھی۔ بھارتیندو ہرش چندر کے عہد
۱۸۵۰ تا ۱۸۸۵ء) میں مخصوص سیاسی اور لسانی
حریک کے تحت ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہی
ذا تاریخی قدامت کا سلسلہ قائم کرنے کے
قصد کے تحت اودھی، برج، میتھلی، چھتیس
گڑھی وغیرہ مختلف زبان و ادب کے آزاد
ور ترقی یافتہ رُوپ بھی ہندی ادب کی تاریخ
حصّہ بنتے رہے۔

شمالی ہندوستان دو جغرافیائی حصّوں
منقسم ہے، دریائے سندھ کی وادی اور
نگا کی وادی۔ ان دونوں کے درمیان کا حصّہ
ہندِ قدیم میں مدھیہ دیش کا حصّہ کہلاتا تھا جو
دریائے ستلج اور دلی کے بیچ اور گنگا کی وادی
کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ اس علاقے کو سیاسی
اور لسانی اعتبار سے شمالی ہندوستان کا دل کہا
گیا ہے۔ اس مدھیہ دیش کے اطراف ویدک
زمانے میں ہند آریائی زبانیں مروج تھیں۔
اس زمانے کی لسانی صورت حال یہ تھی کہ ایک
طرف مدھیہ دیش (MID LAND) کی ہند
آریائی زبانیں تھیں تو دوسری طرف بیرونی گروہ
(OUTER BAND) کی زبانیں تھیں۔
ہندوستانی، پنجابی، راجستھانی اور گجراتی کا شمار
مدھیہ دیش کی زبانوں میں ہوتا ہے اور بیرونی
گروہ (OUTER BAND) کی زبانوں میں
اودھی، بہاری، بنگالی، مراٹھی اور سندھی زبانیں
شامل ہیں۔ بقول گریرسن:

"اندرونی گروہ (مدھیہ دیش) کی زبانوں
کی قواعد چند اوراق پر لکھی جا سکتی ہے، جبکہ
بیرونی گروہ کی ایک زبان سے واقفیت حاصل
کرنے اور ان کے اسما کی تعریف (DECLE-
UTIONS) اور افعال کی گردان (CON-
JUGATION) پر مہارت حاصل کرنے
کے لیے متعدد صفحات درکار ہوں گے۔" چونکہ
مدھیہ دیش کے لوگوں نے ایک طرف مشرقی
پنجاب اور راجپوتانہ فتح کیا اور سمندر تک
پہنچے اور دوسری طرف اودھ اور بنارس کی
طرف بڑھے۔ لہٰذا ان علاقوں میں ملی جلی قواعدی
خصوصیات (FORMS OF SPEECH)
پائی جاتی ہیں۔ شمالی ہندوستان کی زبانوں کو بدقسمتی
سے مشرقی ہندی اور مغربی ہندی کے نام سے
موسوم کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان دونوں میں
لسانی اشتراک اور مماثلتوں کے ہونے کی طرف
ذہن مبذول ہوتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ
مشرقی ہندی اور مغربی ہندی سے مراد دو قطعاً
مختلف خصوصیات رکھنے والی زبانیں ہیں۔ تاریخی
لسانیات کے مشہور عالم ڈاکٹر گنے کا کہنا ہے کہ
"عام طور سے جسے ہندی کہا جاتا ہے اُسے حقیقتاً
دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں پنجابی
اور بہاری کے مقابلے میں مشترک خصوصیات
بہت کم ہیں"

ہندی کے مشہور محقق اور عالم پنڈت
شیام سندر داس، مصنف "بھاشا وگیان" جو
اعلیٰ ہندی کو (HIGH HINDI) اتر پردیش
کی علاقائی زبان کہتے ہیں، اس حقیقت کا اعتراف
کرتے ہیں کہ مشرقی ہندی دراصل نصف
بہاری ہے اور اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی
اس کے تین روپ یا شکلیں ہیں۔ اگرچہ وہ اودھی
کو ہندی کی بولی کہنے کی وکالت کرتے ہیں۔ تاہم
اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اودھی اور
برج دو آزاد ادبی زبانیں ہیں اور ان کا ہندی
سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اودھی کو ہندی کہنے پر
اصرار خالص سیاسی مصلحت اندیشی ہے، ورنہ
حقیقت یہ ہے کہ اتر پردیش ایک کثیر لسانی
ریاست ہے۔ جس میں اردو اور ہندی کے
علاوہ اودھی، برج، بھوجپوری زبانیں برابر
کی شریک ہیں۔ اس لسانی، تاریخی اور ادبی پس منظر
میں ملک محمد جائسی ہندی کے شاعر نہیں کہلائے
جا سکتے۔ اور نہ ہی ان کی تصانیف[1] پدماوت،
اکھراوٹ، آخری کلام اور چترلیکھا کو ہندی کلام
یا شاعری کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] نامی انصاری نے اپنے مضمون ملک محمد جائسی مطبوعہ ایوانِ اردو مئی ۱۹۹۰ء میں ہندی محققین کی طرح پدماوت کو ہندی ادب کا شہکار کہا ہے۔

عبدالستار دلوی

اردو، ہندی اور اودھی

(ایک زاویۂ نظر)

اُردو اور ہندی ادبی اور لسانی اعتبار سے ہندوستان کی دو بڑی اور بہت اہم زبانیں ہیں۔ ان کے آغاز اور ارتقا کی کہانی بہت دلچسپ ہے اور اُردو کے تعلق سے کہیں کہیں سے المناک بھی۔ قدامت کے لحاظ سے اردو کو اوّلیت حاصل ہے جو کھڑی بولی کے روپ میں ترقی کرتی رہی۔ ہندی کے مشہور عالم پنڈت رام چندر شُکل نے اپنی مشہور کتاب "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کھڑی بولی اردو کی شکل پہلے بنی اور ہندی کا روپ بعد میں بنا۔ ہندی اور اُردو میں جو مماثلتیں ہیں وہ بہت کم زبانوں کو میسر ہیں۔ دونوں زبانوں کی قواعدی ساخت یکساں ہے، اسی طرح دونوں زبانوں کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ بھی ایک ہے، لیکن اس مماثلت کے باوجود دونوں میں سماجی لسانیات اور اسلوبیاتی حیثیت سے بڑا فرق ہے۔ لہٰذا اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کہنا یا ایک ہی زبان کے دو روپ قرار دینا لسانی بھول ہے۔ اگر توضیحی لسانیات کی بنیاد پر دونوں میں مماثلت ہے تو سماجی لسانیات اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے ان دونوں میں نمایاں فرق بھی ہے۔ لہٰذا لسانیات کی ان دونوں، بلکہ تینوں شاخوں (توضیحی لسانیات، سماجی لسانیات، اور اسلوبیات) کی روشنی میں ان دونوں زبانوں کو آزاد زبانیں ہی سمجھنا چاہیے۔ ان دونوں زبانوں کا تہذیبی اور لسانی پس منظر جُداگانہ ہے۔ اُردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے جس میں سنسکرت اور عربی و فارسی کے الفاظ اور ان زبانوں کی خصوصیات اظہار کی قوت اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔ ہندی اپنے تہذیبی اور فکری پس منظر کے لیے سنسکرت کے قدیم لسانی سرمایے سے منسلک ہے۔ اردو ادب اور ہندی ساہتیہ کی روایتیں بھی الگ الگ ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے ادب بھی دراصل دو فکری دھارے ہیں اور خالص اسلوبیاتی اعتبار سے ان دونوں میں نمایاں فرق ہے جس کی وجہ سے ان دونوں کو ایک ہی زبان کے دو اسالیب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو اور ہندی میں جو مماثلتیں ہیں ان کا احترام کیا جانا چاہیے اور ان دونوں زبانوں میں ادبی سطح پر ابلاغ و ترسیل کے دھارے کو ترجموں کی مدد سے عام کرنا چاہیے۔ اردو کے مقابلے میں ہندی کا ارتقا اٹھارویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوا اور اس کو سمت اور رفتار بھارتیندو ہرِشچندر نے عطا کی جو خود ابتداً "رسا" تخلص کے تحت اُردو میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے معاصرین میں ستارۂ ہند راجہ شیو پرشاد بھی تھے جو بھارتیندو کے برخلاف اُردو کے حامی تھے۔

زبان اور بولی کا آپس میں گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ زبان بولی کی ترقی یافتہ (STANDAR-DISED) صورت ہے اور بولی زبان کی ایک عام پسند شکل ہے جو معیاری زبانوں کے مقابلے میں عام بول چال میں استعمال ہوتی ہے اور وسیع و عریض مختلف لسانی علاقوں میں مخصوص مقامی الفاظ اور لہجے بھی اپنا لیتی ہے۔ زبان اس کے برعکس مرکز اور ادب کی تابع ہوتی ہے۔ زبان اور بولی میں فرق کیفیت کا نہیں بلکہ کمیّت کا فرق ہوتا ہے اور ان میں آپسی افہام و تفہیم کی شکل بنی رہتی ہے، اس کے برعکس دو زبانیں ادبی سطح پر اور افہام و تفہیم (MUTUAL INTELL-IGIBILITY) کی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ادبی سطح پر اردو اور دکنی اُردو میں جو رشتہ ہے وہ ادبی روایتوں، دو مماثل فکری دھاروں اور آپسی افہام و تفہیم کا رشتہ ہے اردو کا عام قاری دکنی اردو کی ادبی روایتوں کو سمجھتا ہے اور دونوں کی لفظیات سے عام طور سے واقف ہے، لیکن اگر وہ اودھی، برج بھوجپوری اور میتھلی کے علاقوں سے تعلق نہیں رکھتا تو وہ ان زبانوں کے ادب اور زبانوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا جو لسانی اور ادبی رشتہ اردو اور دکنی میں ہے وہ رشتہ اردو اور اودھی، برج بھوجپوری یا میتھلی میں نہ ہونے کی وجہ سے یہ زبانیں آزادانہ زبانوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں اردو کی بولیوں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان زبانوں کے ادب کو تاریخ ادب کا حصہ بنایا جا سکتا ہے، البتہ وہ ادبی نمونے جو کھڑی بولی سے مماثلت رکھتے ہوں اُردو کا بھی سرمایہ ہوں گے۔ کبیر اور میرا بائی کے کلام میں کئی ایسے نمونے ہیں جو خالص لسانی نقطۂ نظر سے برج یا راجستھانی کے مقابلے میں کھڑی بولی کے نمونے ہیں اور ایسے نمونے یقیناً اردو کی میراث

شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی۔ ۴۰۰۰۹۸

اور انھیں اُردو کی ادبی تاریخ کا حصہ بننا چاہیے۔

اودھی کی اپنی ایک آزادانہ ادبی روایت ہے اور اودھی کی اپنی لسانی فضا ہے۔ لہٰذا ں طرح اودھی اردو کی بولی نہیں ہے۔ اسی رح یہ ہندی کی بھی بولی نہیں کہلائی جاسکتی۔ ں کی بنیادی وجہ ان دونوں کا ادبی سرمایہ بھی ہے جو ایک دوسرے سے مختلف ہے اور نہ ں ہندی اور اودھی میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے ہام و تفہیم کی صورت پائی جاتی ہے۔ جو زبان ر بولی کے اعتبار سے دونوں کو ملاتی ہو۔ مولانا ؤد کی چنداین ہو یا مولانا قطبین کی مرگاوتی ر عثمان کی چتراولی، ملک محمد جائسی کی پدماوت د چاہے تلسی داس کی رام چرت مانس، ہندی ، ادبی روایت سے میل نہیں کھاتیں اور نہ ہی بان اور بولی کی بنیادی خصوصیت اور اس کے شتے کی بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ ہندی رٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) کے زمانے میں گریزوں کی سرپرستی میں ترجموں کی صورت میں روان چڑھی۔ بھارتیندو ہرش چندر کے عہد ۱۸۵۰ تا ۱۸۸۵ء) میں مخصوص سیاسی اور لسانی ریک کے تحت ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہی ذا تاریخی قدامت کا سلسلہ قائم کرنے کے قصد کے تحت اودھی، برج، میتھلی، چھتیس ڑھی وغیرہ مختلف زبان و ادب کے آزاد ر ترقی یافتہ رُوپ بھی ہندی ادب کی تاریخ حصہ بنتے رہے۔

شمالی ہندوستان دو جغرافیائی حصوں ں منقسم ہے، دریائے سندھ کی وادی اور نگا کی وادی۔ ان دونوں کے درمیان کا حصہ ہند قدیم میں مدھیہ دیش کا حصہ کہلاتا تھا جو دریائے ستلج اور دلی کے بیچ اور گنگا کی وادی کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ اس علاقے کو سیاسی اور لسانی اعتبار سے شمالی ہندوستان کا دل کہا گیا ہے۔ اس مدھیہ دیش کے اطراف ویدک زمانے میں ہند آریائی زبانیں مروج تھیں۔ اس زمانے کی لسانی صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف مدھیہ دیش (MID LAND) کی ہند آریائی زبانیں تھیں تو دوسری طرف بیرونی گروہ (OUTER BAND) کی زبانیں تھیں۔ ہندوستانی، پنجابی، راجستھانی اور گجراتی کا شمار مدھیہ دیش کی زبانوں میں ہوتا ہے اور بیرونی گروہ (OUTER BAND) کی زبانوں میں اودھی، بہاری، بنگالی، مراٹھی اور سندھی زبانیں شامل ہیں۔ بقول گریرسن:

" اندرونی گروہ (مدھیہ دیش) کی زبانوں کی قواعد چند اوراق پر لکھی جاسکتی ہے، جبکہ بیرونی گروہ کی ایک زبان سے واقفیت حاصل کرنے اور ان کے اسمائی تعریف (DECLE-UTIONS) اور افعال کی گردان (CON-JUGATION) پر مہارت حاصل کرنے کے لیے متعدد صفحات درکار ہوں گے۔" چونکہ مدھیہ دیش کے لوگوں نے ایک طرف مشرقی پنجاب اور راجپوتانہ فتح کیا اور سمندر تک پہنچے اور دوسری طرف اودھ اور بنارس کی طرف بڑھے۔ لہٰذا ان علاقوں میں ملی جلی قواعدی خصوصیات (FORMS OF SPEECH) پائی جاتی ہیں۔ شمالی ہندوستان کی زبانوں کو بدقسمتی سے مشرقی ہندی اور مغربی ہندی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان دونوں میں لسانی اشتراک اور مماثلتوں کے ہونے کی طرف ذہن مبذول ہوتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی ہندی اور مغربی ہندی سے مراد دو قطعاً مختلف خصوصیات رکھنے والی زبانیں ہیں۔ تاریخی لسانیات کے مشہور عالم ڈاکٹر گُنے کا کہنا ہے کہ "عام طور سے جسے ہندی کہا جاتا ہے اُسے حقیقتاً دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں پنجابی اور بہاری کے مقابلے میں مشترک خصوصیات بہت کم ہیں"

ہندی کے مشہور محقق اور عالم پنڈت شیام سندر داس، مصنف "بھاشا وگیان" جو اعلیٰ ہندی کو (HIGH HINDI) اتر پردیش کی علاقائی زبان کہتے ہیں، اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مشرقی ہندی دراصل نصف بہاری ہے اور اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی اس کے تین روپ یا شکلیں ہیں۔ اگرچہ وہ اودھی کو ہندی کی بولی کہنے کی وکالت کرتے ہیں۔ تاہم اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اودھی اور برج دو آزاد ادبی زبانیں ہیں اور ان کا ہندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اودھی کو ہندی کہنے پر اصرار خالص سیاسی مصلحت اندیشی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اترپردیش ایک کثیر لسانی ریاست ہے۔ جس میں اردو اور ہندی کے علاوہ اودھی، برج، بھوجپوری زبانیں برابر کی شریک ہیں۔ اس لسانی تاریخی اور ادبی پس منظر میں ملک محمد جائسی ہندی کے شاعر نہیں کہلائے جاسکتے۔ اور نہ ہی ان کی تصانیف[1] پدماوت، اکھراوٹ، آخری کلام اور چتر لیکھا کو ہندی کلام یا شاعری کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ل نامی انصاری نے اپنے مضمون ملک محمد جائسی مطبوعہ ایوانِ اُردو مئی ۱۹۹۰ء میں ہندی محققین کی طرح پدماوت کو ہندی ادب کا شہکار کہا ہے۔

اسس موضوع یعنی " اودھی کے آغاز اور ارتقا" پر بابورام سکسینہ نے تجزیاتی نقطۂ نظر سے اعلیٰ تحقیقی کام کیا ہے، مگر تاریخی و اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے ان کی تحریر لسانی تنگ دلی ہی کے زمرے میں آتی ہے۔ جو اودھی کو ہندی کی بولی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندی اور اس کی بولیوں کے تعلق سے سیاسی مصلحت اندیشیوں کو خیرباد کہہ کر اور غیر جذباتی ہو کر ان کے مطالعے کیے جائیں اور ہر زبان چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو ان کی آزادانہ حیثیت کو احترام کی نظروں سے دیکھا جائے۔

حوالے کی کتابیں

1. EVOLUTION OF AWADHI BY BA- -BURAM SAKSENA.
2. LINGUISTIC SURVEY OF INDIA VOLS VI & IX.
3. THIS HINDI AND DEVNAGRI BY MADANGOPAL.
4. HINDI SAHITYA KA ITIHAS BY RAMCHANDER SHUKLA.
5. BHASHAVIGYAN BY SHYAM SUNDERDAS.
6. COMPARATIVE PHILOLOGY DR. P.D. GUNE.

کرشن ادیب

جتنی دولت ہے مرے پاس اُٹھا کر لے جا
اپنے ماتھے پہ مرا پیار سجا کر لے جا

ایک ہی داؤ پہ تُو ہار چکا ہے سب کچھ
چند سانسیں ہیں تری ان کو بچا کر لے جا

وہ جو پتھر ہے تو سر پھوڑ کے مر جانا مگر
نقرئی طشت میں پھولوں کو سجا کر لے جا

مجھ کو ہر موج پہ اک حرفِ وفا لکھنا ہے
تُو جو دریا ہے تو پھر مجھ کو بہا کر لے جا

منکشف مجھ کو مری ذات پہ کر دے ورنہ
راز کی طرح مجھے دل میں چھپا کر لے جا

میں کہ اس پیڑ پہ ہوں آخری پتے کی طرح
اے ہوا، تیز ہوا، مجھ کو اُڑا کر لے جا

۱۴/۱۲، پی۔ اے۔ یو، لدھیانہ (پنجاب)

کچھ نہ کچھ تو جذبۂ وحشت اثر لے جائے گا
پاؤں زنجیروں میں رکھے گا تو سر لے جائے گا

راہِ مقتل تک ہمیں لایا تو ہے شوقِ حیات
اس سے آگے اب خدا جانے کدھر لے جائے گا

وہ جو سوکھی شاخ سے رکھے گا اُمیدِ ثمر
خود ہی فصلِ خوش گمانی کاٹ کر لے جائے گا

جو بھی خالی جیب آئے گا بھرے بازار میں
حسرتوں کے ماسوا کیا اپنے گھر لے جائے گا

سب سہارے نام کے اپنی جگہ رہ جائیں گے
منزلوں تک صرف عزمِ معتبر لے جائے گا

اپنی محفل میں ذرا منشا کو تم آنے تو دو
دیکھ لینا لوٹ کر دادِ ہنر لے جائے گا

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

۱۱، اسٹار کی ٹاؤن، ناگپور

اختر بستوی

کون جانے سرد ہیں یا گرم لوگوں کے بدن
برف چہروں پر جمی ہے جل رہے ہیں پیرہن

جنگلوں کو جن سے خائف ہو کے چھوڑ آئے تھے ہم
کیا خبر تھی گھر میں وہ آسیب ہوں گے خیمہ زن

بس اسی کوشش میں ٹوٹا آدمی ہر دور میں
آشکارا ہو نہ پیشانی پہ بستر کی شکن

جب نہیں دل میں کوئی کانٹا کوئی نوکِ سناں
بن گئی ہے کیوں خیالی روگ اک فرضی چبھن

سب سے بچنا آ گیا جس کو اُسے کرنا پڑا
خود کو اپنے آپ سے محفوظ رکھنے کا جتن

رات کا مرہم بھی اختر ہو گیا ہے بے اثر
اس سے بھی جاتی نہیں اب دن کے زخموں کی جلن

شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف گورکھپور، گورکھپور

غلام جیلانی

آٹھواں سفر

اس رات سندباد بہت مسرور تھا کہ اس کے دستر خوان پر مہمانوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی۔ خاصہ بڑھا دیا گیا۔ بڑی بڑی قابوں اور چینی کے منقش بادیوں میں اندلس اور انقرہ کے باغوں کے انگور اور سیب لائے گئے۔ آبنوسی جسم والے سجیلے حبشی غلاموں کے قدم سرخ ایرانی قالینوں کی دبازت میں دھنسے جا رہے تھے۔

اطلسی غلاف والے گاؤ تکیے پر کہنی کے بل جھکتے ہوئے سندباد جہازی نے ایک نظر مہمانوں پر ڈالی؛ اور حیرانی کا ہلکا سا سایہ چہرے پر کوند گیا۔ مخمل کی واسکٹ میں سے چاندی کی گول ڈبیا نکالی اور اس میں سے سنہری ورق میں لپٹا ہوا ایک موتی نکال کر منہ میں ڈال لیا۔ رات کے کھانے کے بعد سندباد کی یہ عادت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔

حیرانی کی بات اس رات یہ ہوئی کہ وہاں اسے ہر رنگ اور نسل کا چہرہ نظر آیا..... چپٹا سیاہ فام، سپاٹ نتھنوں والا چہرہ، خزاں رسیدہ پتے کی طرح مرجھایا ہوا زرد چہرہ، مل گجا مٹیالا چہرہ، جس پر آسیب زدہ ویرانی برس رہی تھی ستواں ناک اور تیکھے نقوش والا چہرہ، جو کبھی خاصا دلکش رہا ہوگا... مگر اب اس کا پاکیزہ رنگ مکدر ہو چکا تھا۔

سندباد نے دیکھا کہ سارے چہروں میں آنکھیں اپنی چمک کھو چکی تھیں..... بے جان مردہ..... پتھر کی سی مصنوعی لگ رہی تھیں۔ اس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔

دلکش، ستواں ناک والے چہرے نے کہا "اے سندباد! ہمیں دیکھ کر یوں حیران نہ ہو۔ ہم بھی کبھی تیری طرح محلوں میں رہتے تھے، ہماری طاعت کے لیے غلام ہوا کرتے تھے۔ ہم دور دراز ملکوں سے آتے ہیں..... سمندروں کے سینے چیر کر، پہاڑوں کو پھلانگ کر۔ ہمارے جزیروں سے کبھی تیرے جہاز بھی گزرے ہوں گے۔ آج ہم خانماں برباد، ملک ملک پھر رہے ہیں۔ مگر تو ہمیشہ کی طرح شاد و آباد ہے۔ یہ کیا راز ہے!..... یہی جاننے کے لیے ہم تیرے یہاں آئے ہیں۔"

سندباد کے ہونٹوں پر خاموش مسکراہٹ پھیلتی گئی۔

مل گجے مٹیالے چہرے نے اسے دیر تک دیکھا— "ہم بھول گئے تھے مسکراہٹ کیسی ہوتی ہے..."

سندباد کی مسکراہٹ سکڑنے لگی۔ اس کی پیشانی پر تردد کا بادل چھا گیا—

"کیا دنیا میں رنج و الم اس درجہ بڑھ گیا ہے!"

"تو صدیوں سے محل سرائے محراب و در چھوڑ کر باہر نہیں گیا..... تو کیا جانے اس دنیا پر کیا کیا بیت گئی!"

سندباد سوچ میں ڈوب گیا۔

"یا پیر و مرشد آپ نے بتایا نہیں یہ دائمی راحت کی زندگی آپ نے کیسے پائی؟"

"سفر"

سب نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔

"سفر"— سندباد نے دہرایا۔

چہرے چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"حیرانی کی کیا بات ہے؟ سفر..... سفر نے ہی مجھے سب کچھ دیا۔ مال و دولت، علم و تجربہ، عقل و دانش۔ میں نے سات سفر کیے تھے۔"

مل گجے، مٹیالے چہرے نے مودبانہ کہا "آپ کے سفروں کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ آپ کا دل دکھانا مقصود نہیں۔ مگر ادھر عرصے سے آپ سفر پر نہیں نکلے۔ ورنہ جان جاتے....." بات ادھوری چھوڑ کر وہ رک گیا۔

سندباد نے آہستہ سے پوچھا "کیا جان جاتا؟"

چپٹی ناک والے سیاہ چہرے نے کہا "اب جزیروں کے لوگ آپ کے جہازوں کو خوش آمدید نہیں کہتے..... آگ لگا دیتے ہیں۔ اور آگ سے بھاگتے ہوئے لوگوں کو کانے دیو پکڑ پکڑ کر بھون کر کھا جاتے ہیں۔"

RT 195/3، وجیا نگر کالونی حیدرآباد ۵۰۰۴۵۷ (اے

مرجھایا ہوا زرد چہرہ بڑی دیر بعد
ترم آقا..... نیلے سمندروں کا پانی
بچکا ہے۔ قزاقوں نے راستوں پر پہرے
ے ہیں۔ بھٹکے ہوئے جہازوں کو اُفق
رمینیں دکھائی نہیں دیتیں.....
ری بھی۔ زیتون کی شاخ نہیں لاتی ــــ اور
ئی جہاز کسی ویران جزیرے کی سنگلاخ
سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے
رینگتے ہوئے انسانی جسموں کے پنجر
جن سے نشے میں بسے ہوئے زہر سے
بو آتی ہے..... اب کون کس طرف
نکلے؟"
کون راہ سجھائے؟..... مچھلی
بھی سیاہ پانی میں الٹی تیر رہی ہے!"
ل گجے چہرے نے کہا۔
بکایک سب چپ ہو گئے۔ سندباد
ے پر سخت تردد کے آثار تھے اس
چاہا ــــ "تم نے ایسے کتنے سفر کیے
...؟" مگر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
ستواں ناک والے نے کہا "آقائے
م مسلسل سفر میں ہی ہیں ــــ جب
سنبھالا ہے۔"
سندباد کے محل میں اب
رت چھا گیا تھا ــــ مطرباؤں
ف اور نفیری کی آوازیں سب
تھے ــــ سندباد نے پہلو بدل کر
اہا مگر پھر چُپ ہو رہا۔
اج سفر ہمارا مقدّر بن چکا ہے..."
ے نے جھریوں میں سے کہا "کون
اپنا وطن چھوڑتا ہے۔ مجبوراً جانا
..... پرندوں کی طرح آب و دانے

کی تلاش میں ــــ"

چپٹے سیاہ فام نے کہا "یا پھر سنگینوں کی نوک پر۔ خوف زدہ لوگوں کے قافلے، بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی طرح ہانک دیے جاتے ہیں..... سرحد پار، اجنبی زمینوں میں.... جہاں نفرتیں اُگتی ہیں۔ دیس نکالا بہت بڑی سزا ہے سندباد ــــ"

سندباد پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ مطمئن نہیں ہوا تھا کہ سفر برکتوں کی بجائے اذیتوں کا وسیلہ بن گیا ہے! ــ "میرے لیے سفر ہمیشہ برکت کا باعث رہا۔"

"وہ اس لیے برادر نامور کہ آپ ہر سفر کے بعد اپنے وطن لوٹتے رہے..... اپنے گھر..... اپنی چھت کے نیچے! شاخ پر گھونسلا برقرار رہے تو پرندے کا وجود بکھرنے نہیں پاتا۔" مل گجے مٹیالے چہرے نے کہا۔

سندباد خاموش بیٹھا رہا۔

"اب کوئی ایک دفعہ گھر چھوڑ جائے تو پھر واپس نہیں آتا!" تیکھے نقوش والے اُداس چہرے نے کہا ــــ "وہ لمحہ بڑا سفاک ہوتا ہے سندباد، جب کوئی گھر کی دہلیز پھلانگ جاتا ہے۔ زمین عورت کی طرح ایک دفعہ چھوٹ جائے تو پھر اجنبی ہو جاتی ہے۔ خدوخال بدل جاتے ہیں، مزاج بدل جاتے ہیں۔ وہ غیر ہو جاتی ہے... خواب، صرف خواب ساتھ چلتے ہیں... فاصلوں کی دیواریں پھاند کر... اذیت ناک خواب! بے وفائی کی سزا دینے کو۔"

تیکھے نقوش والے کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے رک گئی ــــ سب چپ چاپ اُسے تکتے رہے..... آواز پھر ابھرنے لگی...

"اور اب واپس جانے کی فرصت ملے گی تو...... دیر ہو چکی ہوگی۔ کوئی پہچانے گا بھی نہیں!... نہ وہ در و دیوار، نہ گلیاں، نہ راستے، نہ شجر، نہ ان پر بیٹھے ہوئے پرندے..... شاخیں ساکت ہو جائیں گی۔ نغمے رُک جائیں گے..... کون اجنبی آ گیا ہمارے بیچ!... سندباد، وہ خواب والی زمین پھر کبھی نہیں ملتی۔ نہ زمین، نہ محبوب....."

"آدم جو روزِ ازل سے ہجرت میں ہیں..... دوبارہ خُلد میں پہنچ بھی جائیں تو کون جانے یہ جنّت وہی ہوگی؟..... وہ وہاں غیر تو نہیں ہو جائیں گے!"

"ایسا نہیں کہتے... یہ کفر کی باتیں ہیں۔ توبہ کرو معزز مہمان... رب العزت معاف کر دیتا ہے۔" سندباد کی آواز میں احترام کی لرزش تھی۔

اور پھر خاموشی میں سب لوگ سر نیوڑھائے بیٹھے رہے۔

"تو پھر رب العزت نے ہجر مسلسل اور جلاوطنی کی سزا ہمارے مقدّر میں کیوں لکھ دی ہے؟ ــــ نبیوں کو بھی ہجرت کرنی پڑی تھی۔ مگر وہ اسی کا حکم تھا... سندباد، ہم تو نبی نہیں ہیں نہ خدا نے ہمیں اپنی زمینیں چھوڑنے کو کہا..... پھر بھی ہم آج خانہ بدوش دیس دیس پھر رہے ہیں، پناہ کی تلاش میں! کیا تو ہمارے لیے ایک اور سفر نہیں کر سکتا؟... آٹھواں سفر؟"

(بقیہ صـــ۵۴ـــ پر)

او۔پی۔ اگروال زآر علامی

رُباعی اور زحاف عَرَج

ماہنامہ "ایوانِ اردو" دہلی بابت ماہ مئی ۱۹۹۰ء میں حضرت جے رام داس فلک کا ایک مضمون بعنوان "رُباعی کا بنیادی وزن" نظر سے گزرا۔ ہمیں خوشی ہے کہ موصوف نے ہماری تصانیف "کلیدِ عروض" اور "مسلماتِ فن" سے کچھ حوالے دے کر اپنے مضمون کی عمارت کھڑی کی ہے۔

موصوف نے اپنے مضمون کی ابتدا رُباعی کے مشہور مصرعے:

"غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو"

سے کی ہے اور اس مصرعے کے دو اوزان ایک اصل اور دوسرا رعایتی قائم فرماکر آگے بڑھے ہیں۔

اصل وزن: مفعولُ۔ مفاعلن۔ مفاعیلُ۔ فَعَل

رعایتی وزن: مفعولن۔ فاعلن۔ مفاعیلُ۔ فَعَل

مصرع رعایتی وزن میں ڈوبتا ہے۔

از روئے عروض "عروض و ضرب" میں مزاحف رکن کے آخر میں ایک حرف ساکن بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس عمل سے مصرع ناموزوں نہیں ہوتا۔ جس کو تسبیغ یا اذالہ کا نام دیا جاتا ہے۔

فلک صاحب نے مسلماتِ فن صفحہ ۴۳ کے حوالے سے حضرت نظم طباطبائی کا قول نقل کیا ہے جو اس طرح ہے:

"یہ کلیہ تمام بحور اور اوزان میں جاری ہے کہ اگر مصرعے کے آخر میں دو ساکن ہوں تو دوسرے ساکن کو گرادینا یا باقی رکھنا ایک ہی بات ہے۔ اس سے وزن نہیں بدلتا۔"

اس قول کی صراحت یوں کی جاسکتی ہے کہ فاعْ کہو یا فع، فعول کہو یا فعَل، فعلان کہو یا فعلن۔ لہٰذا نظم کا یہ قول نہایت عالمانہ ہے۔

موصوف کہتے ہیں کہ اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے اوزان کو جن کے آخر میں فعَل اور فعول واقع ہوتے ہیں اُنھیں الگ الگ وزن تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں،

موصوف کے اس فرمان پر نشانِ صاد لگانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رُباعی کے اُس مصرعے پر غور کیا جائے جس کو سامنے رکھ کر اوزانِ رُباعی ایجاد ہوئے ہیں۔

اصل مصرع یہ تھا:

غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گور

جس کا وزن یہ ہے:

مفعولن۔ فاعلن۔ مفاعیلُ، فعولَ

لیکن رودکی کے کانوں تک جو مصرع پہنچا اس میں "گور" کی 'ر' کا حذف تھا لہٰذا یہ وزن مقرر ہوا:

مفعولن۔ فاعلن، مفاعیلُ۔ فعَل

رودکی چونکہ عروض کا مزاج آشنا تھا لہٰذا اس نے فعَل کو اذالہ کی صورت دینے سے اس لیے انکار کیا کہ قانونِ عروض اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ملاحظہ ہو:

"اما اگر آخر رکن آخر را تغیری بہ نقصان کردہ باشد تسبیغ و اذالت در وے تصور نتوان کرد چہ در آخر یک رکن ہم بہ نقصان و ہم بزدیات شنیع بود . . ."

معیار الاشعار، صفحہ ۱۰۰

یعنی اگر رکن عروض و ضرب کے جزوِ آخر میں تغیر بہ نقصان ہوا ہو تسبیغ اور اذالت اس میں تصور نہ کیا جائے۔ لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ رودکی اذالہ کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ اس لیے کہ مفاعی لن سے فعَل (مجبوب) بہ نقصان واقع ہوا تھا۔ فعول کو "اہتم" کہنا باون تولہ پاؤ رتی کے مصداق بالکل صحیح ہے۔ رہا فلک صاحب کا یہ قول کہ زحاف "ہتم" (حذف + قصر) آئینِ عروض کے خلاف ہے محض سُنی سنائی بات ہے ان کے اس فرمان میں ذرا بھی دم نہیں چونکہ رُکنِ محذوف اور رُکنِ مقصور کا اجتماع قانونِ عروض کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا رودکی نے بھی فعَل اور فعول کا اجتماع جائز رکھا۔

کلیدِ عروض صفحہ ۱۱۰ پر رُباعی کو چار اوزان پر مشتمل کرنا محض سمجھانے کے لیے ضروری تھا۔ ورنہ اصل وزن وہی ایک ہے۔ یہ اوزان تو اس کی شاخیں ہیں وہ اوزان یہ ہیں:

۱۔ مفعولُ۔ مفاعلن۔ مفاعیلُ۔ فعَل
۲۔ مفعولُ۔ مفاعلن۔ مفاعیلُ۔ فعول
۳۔ مفعول۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فعَل
۴۔ مفعول۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فعول

لیکن جب بات واضح ہوگئی تو اُنھیں اوزان کو دو اوزان میں سمیٹ لیا گیا۔ یعنی:

۱۔ مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیلُ۔ فعَل/فعول
۲۔ مفعول۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فعَل/فعول

موصوف نے قوانینِ رُباعی کی بات چھیڑتے ہوئے معاقبہ اور تخنیق کی بات بھی کی

۱۰۵۷، سیکٹر ۱۳، عربن اسٹیٹ، کرنال (ہریانہ)

صفحہ ۶۰ کے حوالے بھی دیے ہیں۔ موصوف کو
لم معاقبہ پر کسی قسم کا اعتراض نہیں لیکن تخنیق
ے متعلق ہمارا حوالہ اس طرح نقل کیا ہے "کلیدِ
روض صفحہ ۶۰ تسکین اور تخنیق کے تحت لکھا ہے
ہ محقق طوسی نے تسکین اوسط اور تخنیق میں کوئی
رق نہیں رکھا۔ بل کہ تخنیق کو تسکین اوسط ہی کے
م سے تعبیر کیا ہے . . . کلیدِ عروض صفحہ ۱۹ پر
ھا ہے کہ محقق طوسی نے اضمار اور عصب کو
یکھ کر زحاف تسکین ایجاد فرمایا۔" یہ محض غلط فہمی
ہے۔" صفحہ ۵۳ پر تسکین کی تعریف لکھی ہے کہ ۳
رکات متوالی میں سے درمیان کی حرکت کو ساکن
کرنا۔" یہ تعریف غلط ہے۔ اگر یہ تعریف صحیح ہوتی
و کلیدِ عروض صفحہ ۶۳ پر مفاعَلَتُن اور مُتَفاعلن
و معصوب و مضمر یعنی زحاف عصب اور اضمار
سے مفاعی لن اور مس تف علن نہ بنایا جاتا۔ بلکہ
سکینِ اوسط سے مفاعی لن اور مس تف علن بنائے
باتے . . ."

ہم اس مقام پر فلک صاحب سے یہ
بانا چاہیں گے کہ زحافات اضمار اور عصب کس
ی ایجادات ہیں۔ اور وہ زمانہ زحاف تسکین
ی ایجاد سے پہلے کا زمانہ ہے یا بعد کا؟ اگر زحاف
سکین کا زمانہ ایجاد عصب اور اضمار کی ایجاد
سے پہلے کا زمانہ تھا تو ان کا اعتراض بالکل صحیح
ورنہ سراسر غلط۔

فلک صاحب نے ہماری تعریف تسکین
کو غلط قرار دیا ہے جو دعویٰ بے دلیل ہے انھیں
صحیح تعریف دینا چاہیے تھی۔ ہم اچھی طرح جانتے
ہیں کہ وہ عروض کی کس بھول بھلیاں میں اُلجھے
ہوئے ہیں۔

ایک زمانہ پہلے "پیغام سونی پت" میں
تھی اور انھوں نے ہماری دلائل کو سمجھتے ہوئے
سببِ ثقیل کی بات کرنا چھوڑ دی تھی لیکن آج
جب وہ تسکین اوسط کی تعریف غلط قرار دے
رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں
سببِ ثقیل پھر کروٹیں لے رہا ہے۔

کیا فلک صاحب واضح طور پر تسکین اوسط
کی تعریف فرما کر اپنا موقف سامنے لانے کی
زحمت اُٹھائیں گے؟

"مسلماتِ فن" صفحہ ۵۱ اور صفحہ ۵۲
سے متعلق فلک صاحب کے قول سے ہمیں کوئی
اختلاف نہیں۔ چوں کہ رُباعی کے جملہ اوزان
خواہ وہ 'مفعول' سے شروع ہونے والے
ہوں یا 'مفعولن یا فاعلن' سے شروع ہونے
والے ہوں ایک ہی وزن کے مرہونِ منت ہیں۔
اور وہ وزن ہے "مفعول، مفاعلن، مفاعیلُ،
فَعَل/فعول۔

اب رہا یہ سوال کہ ان کو پھیلانے کی کیا
ضرورت تھی۔

ہمیں اس پر روشنی ڈالنے کی اس لیے
ضرورت نہیں کہ ان اوزان کے دینے سے جو
جو اوزان سامنے آئے ان سے روشناس ہونا
ہر عروضی کے بس میں نہیں تھا۔ علام سحر عشق آبادی
مرحوم کی ایجاد سے پہلے رُباعی کے صرف ۲۴
اوزان ہی منظرِ عام پر تھے اور ان کو شجرۂ اخرب
اور شجرۂ اخرم کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔
زار علامی کے "فاعلن" سے شروع ہونے
والے اوزانِ رُباعی سے فلک صاحب جیسے فاضل
فنکار بھی اس وقت تک ناآشنا تھے جب تک
کہ وہ منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔
ہمارے "فاعلن" والے اوزان دیکھنے
میں مزید اوزان دریافت فرمالیں ہمارے اس
دعوے کو کہ اب رباعی کے اوزان میں کسی قسم کے
اضافے کی گنجائش نہیں غلط ثابت کریں۔

قانون رُباعی "سبب پے سبب است
وتد پے وتد است" کی وضاحت کرتے ہوئے
فلک صاحب کہتے ہیں: "اگر پہلے رکن کا آخری
جزو سبب یا وتد ہے تو اس کے بعد آنے والے
رکن کا پہلا جزو بھی سبب یا وتد ہونا چاہیے۔
ماقبل رکن کا آخری جزو سبب ہوگا تو مابعد
رکن کا پہلا جزو سبب ہوگا۔ اسی طرح اگر وتد
آخری جزو ہوگا تو اولین جزو بھی وتد ہوگا۔ وتد
مجموع بھی ہو سکتا ہے مفروق بھی۔ اس سے
کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخری رُکن میں اگر ایک
حرف زائد ہے تو اس حرف کی نفی کر کے سبب
یا وتد کا تعیّن ہوگا۔"

مسلمات فن صفحہ ۵۵ پر . . . آخری
جملہ یہ لکھا ہے کہ ان اٹھارہ اوزان کے اضافے سے
اب رُباعی ۵۴ اوزان پر مشتمل ہو گئی۔ ان اوزان
کے علاوہ اب رُباعی کے اوزان میں کسی قسم کے
اضافے کی گنجائش نہیں۔ فرماتے ہیں کہ اس دعوے
کو تسلیم کرنے سے پہلے زحاف عَرَج پر غور کرنا
درست ہوگا۔

عَرَج: "اس زحاف کے ذریعے آخری
رُکن کے آخری وتد مجموع سے دوسرا حرفِ متحرک
ساکن کیا جاتا ہے۔ کلیدِ عروض صفحہ ۶۷ پر ارکان
مزاحفہ از مولف کے تحت ۲۷ پر جبّ و عرج
کے عمل سے مفاعی لن سے فاعْ حاصل کیا گیا
ہے۔ کلید عروض صفحہ ۵۳ پر ۲۵ زحافات مفرد
کے تحت زحاف "جبّ" کے عمل سے مفاعی لن
فعَل حاصل کیا گیا ہے۔ رُباعی میں فعَل عروض

ضرب میں واقع ہوتا ہے اگر اس کی جگہ "فاع" رکھا جائے تو از روئے عروض بالکل صحیح ہے اور کوئی امر مانع نہیں۔"

یہ صراحت کرنے کے بعد موصوف نے مندرجہ ذیل اٹھارہ وزن ایجاد فرمانے کا دعویٰ کیا ہے۔

عَرَج شدہ اوزان ملاحظہ ہوں: (مفعول سے شروع ہونے والے)

۱۔ مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیلُ۔ فاع
۲۔ مفعول۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فاع
۳۔ مفعول۔ مفاعی لن۔ مفعول۔ فاع
۴۔ مفعولُ۔ مفاعلن۔ مفاعلن۔ فاع
۵۔ مفعول۔ مفاعیلُ۔ مفاعلن۔ فاع
۶۔ مفعول۔ مفاعی لن۔ مفاعلن۔ فاع

"عَرَج شدہ" مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان:

۱۔ مفعولن۔ فاعلن۔ مفاعیلُ۔ فاع
۲۔ مفعولن۔ مفعول۔ مفاعیلُ۔ فاع
۳۔ مفعولن۔ مفعولن۔ مفعول۔ فاع
۴۔ مفعولن۔ فاعلن۔ مفاعلن۔ فاع
۵۔ مفعولن۔ مفعول۔ مفاعلن۔ فاع
۶۔ مفعولن۔ مفعولن۔ فاعلن۔ فاع

"عرج شدہ" فاعلن سے شروع ہونے والے اوزان:

۱۔ فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فاع
۲۔ فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعیل۔ فاع
۳۔ فاعلن۔ مفاعیلن۔ مفعول۔ فاع
۴۔ فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعلن۔ فاع
۵۔ فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعلن۔ فاع
۶۔ فاعلن۔ مفاعی لن۔ فاعلن۔ فاع

ہم اس مقام پر فلک صاحب سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کے تجویز کردہ "فاع" کی عروضی حیثیت کیا ہے؟ زحاف عَرَج سے انھوں نے 'مَفَا' کے ف کو ساکن کیا۔ لہٰذا یہ صورت ہوئی "مَ فْ آ" یعنی 'م' کے بعد کے دونوں حروف ساکن جس کو "فاع" بسکونِ 'عین' تبدیل کر لیا گیا۔ اس "فاع" کو ہرگز وتد نہیں کہہ سکتے "وتد مجموع" میں پہلے دونوں حرف متحرک ہوتے ہیں اور تیسرا حرف ساکن ہوتا ہے "وتد مفروق" میں پہلا اور آخری حرف متحرک ہوتا ہے۔ درمیان کا حرف ساکن ہوتا ہے۔ اس "فاع" میں تو کوئی بھی صورت نہ رہی۔ اور جب "فاع" وتد نہ رہا تو رباعی کے قانون "سبب پے سبب است..." کا کیا بنا۔ کیا یہ انحرافِ قاعدہ رباعی نہیں۔ اگر ہے تو فلک صاحب کا یہ اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کو بذریعہ ایوانِ اُردو تسلیم کریں۔

ایک بات اور فلک صاحب نے فعَلَ کے مقابل "فاع" رکھنے کی تجویز فرمائی ہے فعَلَ کی جگہ از روئے قاعدہ 'فعول' رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ 'فعول' کی جگہ بھی 'فاع' رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن فلک صاحب نے ایسا کرنے سے احتراز کیا ہے۔ کیا فلک صاحب اپنے اس ترجیح بلا مُرجح عمل کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں گے؟

ہمارے نزدیک فلک صاحب کے تجویز کردہ تمام اوزان مہمل اور لغو ہیں۔

اِک تھکا سا دن، ہر اِک دن، مضطرب ہر رات ہے
اِک تعطّل، اِک اُداسی، ہم سفر ہے، سات ہے

عشق کیا ہے؟ اِک دلِ سادہ کی صورت ہے یہاں
حُسن ہے تو حُسن کی بھیدوں بھری ہر بات ہے

حُسن سے راز و نیازِ عشق اور یہ ساعتیں!
جُرعہ جُرعہ بے خودی ہے، ابر ہے، برسات ہے

اہلِ دل، اہلِ وفا کا کوئی اِک مقتل نہیں
قاتلوں کی بستیوں میں ہر ڈگر اِک گھات ہے

آج پھر وہ سامنے ہے اور لب خاموش ہیں!
مُدّتوں پہلے کی چاہت، پھر نئی سی بات ہے

دوّر آفریدی

گھیر عثمان خاں، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یو۔پی)

الطاف صمدانی

جو دل ہمارا لہو لہو ہے
ہر ایک جذبہ لہو لہو ہے
کیا ہے سورج کو کس نے زخمی
سحر کا چہرہ لہو لہو ہے
ہوائیں خنجر بنی ہوئی ہیں
بدن گلوں کا لہو لہو ہے
پڑھو گے کیسے کتابِ ہستی
ہر ایک صفحہ لہو لہو ہے
خراجِ دیدہ وری ہے شاید
جو چشمِ بینا لہو لہو ہے
ضرور لائے گا رنگ اِک دن
جنابِ والا لہو، لہو ہے
گلاب لہجے کا تھا پیمبر
وہ جس کا لہجہ لہو لہو ہے
صلہ ہے پتّھر سے دوستی کا
جو دل کا شیشہ لہو لہو ہے

مکان نمبر ۴/۳۱۰-۱-۷، نزد بخشی کا نل، بند ناکہ، عیدی بازار، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۳

اسیرِ وہم ہوتے فرقِ خیر و شر بھی گیا
یقیں گیا تو دعاؤں سے وہ اثر بھی گیا

سکھا دیے ہیں ہمیں وقت نے سفر کے اصول
تبھی تو دل سے وہ اِک شوقِ ہمسفر بھی گیا

نہ کوئی چہرہ نہ منظر نہ کوئی پرچھائیں
میں گُم ہوا تو وہ سرمایۂ نظر بھی گیا

کوئی نیا تو نہیں یہ سفر خلاؤں کا
حدِ گماں سے تو آگے میں بیشتر بھی گیا

اب اور کس کا تجھے انتظار ہے راشد
اٹھا تھا دل میں جو طوفان وہ گزر بھی گیا

راشد ندیم

باڑوزئی اوّل، شاہ جہاں پور ۲۴۲۰۰۱ (یو۔پی)

عبدالعزیز خان

گیلری

وجے نے شرٹ کی جیب سے کاغذ نکال کر پتہ دیکھا۔ بلڈنگ کا نام پڑھا۔ تیسرے منزلے پر بائیں طرف کا بلاک۔ کاغذ جیب میں رکھ کر وجے زینے سے اوپر چڑھنے لگا۔ چاروں طرف عجیب سا سناٹا تھا۔ وجے نے سوچا اب اسی سناٹے سے دوستی ہوگی۔

تیسرے منزلے پر پہنچ کر دیکھا کہ دو دروازے تھے۔ اُس نے نیم پلیٹ پڑھی اور کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

اندر بیل بجی۔

ایک بوڑھی عورت نے دروازہ ذرا سا کھولا اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ وجے نے اپنا نام بتایا اور کہا۔

"میں نے خط لکھا تھا۔ پتہ چلا کہ آپ کے پاس کمرہ ہے؟"

بوڑھی عورت نے دروازہ پورا کھول دیا۔ وہ مسکرائی ـــــ عمر ساٹھ سے زیادہ ہوگی۔ سانولے رنگ کی تھل تھل جسم والی بڑھیا، سر کے بال سفید ہوگئے تھے مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔

اس نے وجے کو اندر بلایا۔

یہاں آنے سے پہلے اُس کے ایک دُور کے رشتے دار کے دوست نے اُسے بتایا تھا کہ بڑھیا کے ساتھ اس کی بیٹی بھی رہتی ہے اور دونوں نرسیں ہیں۔ بڑھیا ریٹائر ہوچکی ہے اور بیٹی ابھی پرائیویٹ نرس کے طور پر کام کرتی ہے۔

"پہلے چائے لیں گے یا کمرہ دیکھیں گے؟" بڑھیا نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولی، "پہلے کمرہ دیکھ لیجیے پھر آرام سے چائے لیں گے۔"

وجے جہاں بیٹھا تھا وہ ہال تھا۔ بغل میں ایک چھوٹا سا کچن۔ بائیں طرف ایک کمرہ۔ کمرے کا دروازہ کھول کر بڑھیا نے کہا۔

"یہ آپ کا کمرہ ہے دیکھ لیجیے۔ ہوادار ہے ہم نے صفائی کر کے رکھا ہے۔ باہر ہم لوگ رہیں گے۔"

کمرہ دس بائی دس کا تھا۔ اندر ایک لوہے کا پلنگ بچھا تھا۔

دیواریں ننگی تھیں۔

وجے کو کمرہ پسند آیا۔

گیلری میں وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ شہر کے شور شرابے سے دور مضافات میں بسی ہوئی یہ بستی۔ تھوڑی دور پر لوکل ٹرین کی لائن نظر آ رہی تھی۔ ایک طرف گارڈن اور پارک بن رہا تھا۔ دوسری طرف مزدور کدال اور پھاوڑوں سے زمین برابر کر رہے تھے۔

بڑھیا بولی، "اسٹیشن سے قریب ایسی جگہ ملنا محال ہے اور پھر کمرہ ہوادار تو اتنا کہ آپ کو پنکھے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہاں جو کام چل رہا ہے وہ سو سال پرانا قبرستان ہے۔ لوگ وہاں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ بہت دنوں تک وہ زمین یوں ہی پڑی رہی مگر اب اس جگہ پر گارڈن اور پارک بن رہے ہیں۔"

وجے نے قبرستان کی طرف دیکھا۔ قبریں کھودی جا رہی تھیں۔ اُسے لگا جیسے وہ مزدور نہ ہوں بجّو ہوں اور قبریں کھود رہے ہوں۔ اب مُردوں کی شانتی بھنگ ہوگی۔ گارڈن اور پارک میں آنے والی نوخیز نسل وہاں کھیلے گی۔ تب تک لوگ یہ بھول جائیں گے کہ کبھی وہ قبرستان تھا۔ مگر کیا وجے خود یہ بات بھول سکے گا؟ وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ تب اسے گارڈن اور پارک نظر نہ آئے۔ بس ہر طرف قبریں ہی قبریں دکھائی دیں۔ بچپن میں پتہ نہیں کون سا واقعہ اس کی نظر سے گزرا تھا۔ اب لاکھ چاہنے پر بھی اُسے وہ یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ مُردوں کے دفنائے یا جلائے جانے کے خلاف نفرت سی بھر گئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے کسی کے جنازے میں شریک ہوتا تھا۔

بڑھیا نے وجے کی سنجیدگی پر غور نہیں کیا۔ قبرستان کی بغل میں رہنا اُس کی عادت ہوگئی تھی۔

چائے بناتے ہوئے وہ بولی، "اب کاہے کا قبرستان۔ جب میں اسپتال میں تھی تب روز کوئی نہ کوئی مرتا تھا۔ جنرل وارڈ میں جب کوئی مرتا تب ہم اُس کے پلنگ کے چاروں طرف پردے لگا دیتے اور زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہتی۔ پردوں کے اندر مُردہ پڑا رہتا اور اُسی وارڈ میں دوسرے مریض ہنستے ہوئے ٹی۔ وی۔ دیکھتے رہتے۔ روٹین کے مطابق اپنے کام کاج میں غرق رہتے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

"مرنے کی بات سُن کر میرا رُواں رُواں خوف سے کھڑا ہو جاتا ہے۔"

"مرنا تو سب کو ہے بابا!"

امین بلڈنگ، ۴ منزلہ، فلیٹ نمبر ۲۱، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

"مگر مُردے دیکھ دیکھ کر آپ کے دماغ پر تناؤ نہیں رہتا تھا؟"

"نہیں ـــــ میں عادی ہوچکی تھی۔ جذبات سے عاری اور مُردوں کے درمیان رہنے کی عادی۔ خیر یہ لو چائے ـــــ"

وجے نے چائے کا کپ لیا۔

"تم کیا کرتے ہو؟"

"میں ٹیچر ہوں ـــــ"

"تم تھکے ہوگے۔ مُنہ ہاتھ دھوکر ذرا آرام کرلو۔ پھر باتیں کریں گے اور چاہو تو نہالو۔ پانی غسل خانے میں ہے۔"

نہانے کا اس کا موڈ نہیں تھا۔ وہ چائے پی کر واش بیسن کی طرف چلا گیا اور مُنہ ہاتھ دھویا۔ پھر جاکر پلنگ پر لیٹ گیا۔

◄

جب اُس کی آنکھ کھلی تو بڑھیا سے کوئی عورت بات کررہی تھی۔ اُس نے سوچا رِجا ہوگی۔

وجے کا سامان صرف ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔ سوٹ کیس اُس نے پلنگ کے نیچے رکھ دیا تھا اور تین چار انگریزی ناول نکال کر پلنگ پر رکھ لیے تھے۔ گیلری میں تولیہ سوکھ رہا تھا۔ وہ لوگ باہر ہال میں کسی کی موت پر بات کررہے تھے۔

موت! موت! موت! جس چیز سے اُسے نفرت ہے وہی بات!

بڑھیا کی آواز آئی۔ "کیا واقعی مرگئے؟ کل تو تُو کہہ رہی تھی کہ ان کی حالت اچھی ہے؟"

"ہاں! کل تک سب ٹھیک تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے مگر صبح قے ہوئی۔ میں فون کرنے دوڑی مگر ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی انھوں نے دم توڑ دیا۔" رِجا کی آواز۔

وہ چونک گیا۔ "کون مَرا ہوگا؟"

وہ باہر آیا۔ رِجا کرسی پر بیٹھی تھی۔ بڑھیا نے رِجا سے وجے کا تعارف کراتے ہوئے کہا "اِن سے ملو یہ ہمارے پیئنگ گیسٹ ہیں۔"

"ہیلو!"

"ہیلو! کون مرا ہے؟"

رِجا کی رنگت سانولی تھی مگر قبول صورت تھی۔ 'ہاں! تو یہ ہے رِجا ـــــ' اُس کا اندازہ صحیح نکلا' اس نے سوچا۔

بڑھیا نے جواب دیا۔ "ایک رئیس زادے تھے' مریض تھے اور رِجا انھیں اٹینڈ کرتی تھی۔ مرگئے بے چارے!"

"عمر کیا تھی؟" وجے نے پوچھا۔

"ستّر سال۔" رِجا بولی۔

ستّر سال کے مریض کے مرجانے پر یہ لوگ اتنے دُکھی کیوں ہیں؟ وجے نے سوچا۔

"اُن کے گھر میں کون کون ہے؟" اُس نے یوں ہی پوچھ لیا۔ اُسے لگا شاید ان کا غم بانٹنا اچھا ہوگا۔

"لڑکا ہے۔" رِجا بولی۔ "امریکہ میں ہے۔ دوسرا لڑکا ٹور پر رہتا ہے۔ وہ فی الحال یہیں ہے مگر کوئی رویا نہیں۔ سب جیسے اُس کی موت کا انتظار کررہے تھے۔ بچے' بیوی' لڑکا سب کے سب۔"

پھر وجے کی طرف دیکھ کر بڑھیا بولی' "رِجا تھی اس لیے اتنا سنبھالا ورنہ کُتّے نے بھی پوچھا نہ ہوتا۔ کیا فائدہ پیسوں کا جو اپنے ہی کام نہ آئے؟"

بڑھیا کچن میں چلی گئی اور وہاں سے بولی "اور تحفے کتنے دیتے تھے۔ ساڑیاں' پرفیوم' میک اپ کِٹ' فورہنڈ اسٹریو' ریڈیو کیسیٹ ریکارڈر بھی انھوں نے بھجوایا تھا۔"

وجے اپنے کمرے میں چلا گیا اور ناول پڑھنے لگا۔ جلد ہی اُکتا گیا۔ پھر گیلری میں آکر کھڑا ہوگیا۔ قبریں کھودی جارہی تھیں۔ کچھ قبریں باقی تھیں۔

رِجا اُس کے کمرے میں چلی آئی۔ پھر گیلری میں آکر اُس کی بغل میں کھڑی ہوگئی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

وجے چونک گیا!

"کچھ نہیں ـــــ سامنے گارڈن اور پارک ہیں مگر قبرستان پر وہ سب بنے ہیں اور یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس لیے میں سنجیدہ ہوگیا۔ اگر مجھے پہلے سے پتہ ہوتا تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔"

"اِس میں اتنا سنجیدہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ دھیرے دھیرے آپ بھی اس ماحول کے عادی ہوجائیں گے۔ ویسے آپ کیا کرتے ہیں؟"

"ٹیچر ہوں۔ کہانیاں بھی لکھتا ہوں۔"

"اچھا... بڑی اچھی بات ہے۔ آپ میری کہانی لکھیں گے؟ ایک نرس پر...؟" اور وہ کھلکھلا اُٹھی۔

وجے مسکرا دیا۔

◄

رات وجے نے سوچا' اگر یہاں کے ماحول کا وہ عادی ہوجائے تو پھر آگے چین ہی چین ہے۔ بلاک بڑھیا کے نام ہے۔ رِجا کماؤ لڑکی ہے۔ شادی کے بعد...؟

مگر قریب کے قبرستان کے بارے میں سوچ کر اُسے دہشت ہونے لگی۔

صبح اُٹھا۔ اتوار تھا۔ اس نے رچا کے بارے میں بڑھیا سے پوچھا۔

بڑھیا بولی، "وہ مریض جن کا کل انتقال ہوا وہاں سے اُسے مہینہ بھر کی تنخواہ لینی ہے۔ مگر شاید اب وہ تحفے نہ ملیں جن کا انھوں نے کہا تھا!"

بڑھیا کی یہ بات اسے بہت بری لگی اُسے لگا اتنا سب ہونے پر بھی کتنا لالچ ہے ان لوگوں میں!

"اُس مریض کے مرنے سے آپ لوگوں کو بہت دُکھ ہوا ہوگا؟"

"آمدنی تھی بابا ____ تنخواہ کے علاوہ تین چار سو کبھی پانچ سو ایکسٹرا مل جاتے تھے اور تحفے الگ۔۔۔"

"رچا کے پتا جی؟"

"وہ تو جب رچا پانچ سال کی تھی چل بسے، رچا کو میں نے بیٹے جیسا پالا اور باپ کا پیار دیا۔"

▶

شام۔۔۔

رچا وجے سے بولی۔ "پیسے تو مل گئے مگر چھ مہینے جو میں نے بوڑھے کی اتنی خدمت کی انھوں نے اُس کے بدلے مجھے کچھ نہ دیا۔۔۔ ماں سچ کہتی ہے کہ مریض کے جیتے جی اُس سے سب کچھ لے لینا چاہیے۔"

وجے کو پھر بُرا لگا۔

پتہ نہیں کیوں نہ بڑھیا کی باتیں اُسے اچھی لگ رہی تھیں نہ رچا کی ____ ایک تو قبرستان اُس پر گارڈن اور پارک، اور وہاں سے آنے والی ہوا۔ اُس طرف کھلنے والی کھڑکیاں اور گیلری میں کھڑے ہو جاؤ تو قبریں ہی قبریں۔۔۔ اور پھر یہ لوگ ہمیشہ مرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ پیسے کے بارے میں کہتے ہیں۔ عجیب نیچر ہے دونوں کا۔

وجے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔ مگر وہاں رچا آ گئی۔ اور پھر وہی مریضوں کے تعلق سے باتیں کرنے لگی۔

کون کیسا تھا؟ کس نے کتنا دیا؟

"ماں کا اچھا تھا۔ کوئی مرے یا جیے۔ سرکاری نوکری تھی۔ مگر میرے نصیب میں یہ فری لانسنگ مریض جلد مرا تو دُکھ اچھا ہوا تو بھی دُکھ ____ اور پھر نئے نئے مریضوں کا انتظار کرو ____ کافی تناؤ رہتا ہے۔ اور پھر نرسوں کی بھی تو بہتات ہے؟ وہ تو ٹھیک ہے کہ ماں کے بعد بلاک میرے نام ہو جائے گا!"

◀

ایک مرتبہ رچا ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ وجے چائے پی رہا تھا۔

"اب چنتا کی کوئی بات نہیں۔ مل گئی۔۔۔ لیڈی مریض مل گئی۔۔۔ اُسے پھر ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

کچن کے اندر ہی سے بڑھیا بولی، "آیا نہ اٹیک آخر۔ اب آئیں گے اور پاؤں پڑیں گے۔ اے بھگوان کرپا کر۔ اب کم از کم سال بھر جھولنے دے!"

وجے کو پھر بُرا لگا۔۔۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رچا بھی اس کے پیچھے چلی آئی اور ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "یہ آپ کے لیے ہے۔ میں نے سوچا تھا جب نیا مریض ملے گا تو آپ کو تحفہ نذر کروں گی۔"

"مگر یہ کیا ہے؟"

"شرٹ پیس، بامبے ڈائنگ کا ہے۔"

▶

دو ڈھائی مہینے گذر گئے۔

بڑھیا کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ وجے اور رچا کی شادی ہو جائے، اُس نے کہا بھی تھا۔

"رچا کی شادی ہو جائے بس۔ پھر میں بے فکر ہو جاؤں گی۔"

"آپ نے لڑکا نہیں دیکھا؟" وجے نے بڑھیا سے پوچھا۔

"دیکھے ____ مگر رچا کو کوئی پسند نہ آیا۔"

▶

دوپہر تھی

بڑھیا مارکیٹ گئی تھی۔

رچا وجے کے کمرے میں چلی آئی اور کہا، "چلو ____ باہر گھومنے چلیں؟"

"۔۔۔۔۔۔"

"کل ماں نے پوچھا تھا۔"

"کیا؟"

"تم تو کچھ کہتے نہیں۔ میں نے کہا میں ہی پوچھ لوں گی۔"

"مگر کیا؟" وجے رچا کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ اُسے چاروں طرف قبریں ہی قبریں نظر آ رہی تھیں ____

"ماں چاہتی ہے میں شادی کر لوں؟"

"تو کر لو!"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں؟"

اس سے پہلے کہ وجے کوئی جواب دیتا ایک منظر اس کے ذہن میں تیرنے لگا۔ رچا سوچ رہی ہے، بڑھیا کی موت سے متعلق! اس کا مرنا یعنی بلاک کا رچا کے نام ہو جانا؟ لاش کو جلانے کے بعد جیسی بو چاروں طرف پھیلتی ہے

سے لگا جیسے وہ بوبلاک کے کمروں میں بھرتی جارہی ہے،
چا اور وہ زمین کو سپاٹ بنا رہے ہیں۔ رچا
کے ہاتھوں میں کدال ہے اور وجے کے ہاتھوں
بں پھاؤڑا۔

وجے کا دم گھٹنے لگا۔

وہ اُٹھا ——

" گھومنے کے لیے جی نہیں چاہتا" یہ
کہہ کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا —— رچا فکرمند تھی۔

" رات نیند نہیں آئی۔ اس لیے بے چینی
ہے۔ میں ذرا سوتا ہوں "

◄

وجے نے سوچ لیا۔ اُس کے ذہن میں
آئیڈیل بیوی کا تصور رچا سے میل نہیں کھاتا
تھا ——

گھر میں رچا نہیں تھی ——

اس نے کچن میں جاکر بڑھیا سے کہا،
" میں گاؤں جا رہا ہوں —— کچھ کام ہے"
" کتنے دن میں آؤ گے ؟"
" جلد ہی آجاؤں گا۔ رچا سے کہہ دینا"
اپنے کمرے میں وہ لوٹ آیا اور سوٹ کیس

میں کپڑے بھرنے لگا۔

بڑھیا سمجھ گئی کہ وہ اب نہیں آئے گا ؟

وہ سوٹ کیس لے کر کمرے سے باہر نکلا۔
کچن میں بڑھیا کو کوشش کیا اور باہر آگیا۔ چاروں
طرف قبریں ہی قبریں تھیں اور آسمان دھوئیں
سے بھر گیا تھا ——

بڑھیا ہاتھ پونچھتی وجے کے کمرے میں
داخل ہوئی۔ پلنگ پر رچا کا دیا ہوا تحفہ
شرٹ بیس پڑا ہوا تھا۔

محمد رضی الدین معظّم

حیدرآباد ــــ فرخندہ بنیاد

(حال ہی میں جس کا چار سو سالہ جشنِ سالگرہ منایا گیا!)

۹۹۹ ہجری مطابق ۱۵۹۰ عیسوی میں سرزمینِ دکن پر محمد قلی نے حیدرآباد کی بنیاد ڈالی اور اسے اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ وسطِ شہر میں مشہد مقدس کے روضے کے نمونے پر اس عہد کی یادگار عمارت چارمینار تعمیر کروائی جس کے متصل دولت خانۂ عالی کی عمارت تعمیر ہوئی۔

چارمینار کی عمارت میں ایک مسجد اور ایک حوض بھی تھا جہاں جل پلّی کے تالاب سے پانی آتا تھا۔ ۱۱۸۵ھ تک اس حوض میں پانی آتا رہا۔ چارمینار کی تاریخ تعمیر "یا حافظ" ہے اور تین لاکھ کے صرفے سے یہ عمارت بنی تھی۔ چارمینار کے ساتھ اس کے چار طرف بازار بنائے گئے جن میں ہزار ہا دکانیں آج بھی موجود ہیں۔ چارمینار کے شمال کی جانب شاہی محل "دولت خانۂ عالی" تعمیر ہوا تھا۔ دولت خانۂ عالی کے چار دروازے تھے جو آج بھی چار کمانوں کی صورت میں باقی ہیں۔ اور چار کمان، مچھلی کمان، کالی کمان یا شیور شاد کی کمان اور سحرِ باطل کی کمان سے موسوم ہیں۔ گلزار حوض بھی ان چاروں کمانوں کے بیچوں بیچ واقع اسی زمانے کی یادگار ہے۔

قطب شاہی دور میں ندی کے دوسری جانب یعنی شمال کی طرف ندی سے متصل کوئی آبادی نہیں بسائی گئی تھی گوکہ جو مقامات آباد تھے ان کو پُر رونق و پُر فضا بنا دیا گیا تھا چنانچہ گوشہ محل، لنگم پلی وغیرہ کے محل اور بارہ دری تعمیر ہوئے تھے۔ سلطان عبداللہ اور تانا شاہ کے زمانے میں یہاں بادشاہی قیام سے بڑی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ ۱۱۷۵ھ میں جب حیدرآباد آصف جاہی حکمرانوں کا مستقر بن گیا تو یہاں کی آبادی میں مسلسل اضافہ ہونے لگا۔ شمال کی جانب بھی آبادی بڑھنے لگی۔ یکے بعد دیگرے "چادر گھاٹ کا پُل" (۱۲۴۶ھ م ۱۸۳۱ء) تعمیر ہوا اور نیا پُل جسے افضل گنج کا پُل بھی کہتے ہیں ۱۲۷۶ھ م ۱۸۶۱ء میں اور مسلم جنگ کا پل ۱۳۲۸ھ م ۱۹۰۲ء میں تعمیر کیے گئے۔

عہدِ آصفی کے آغاز میں دارالسلطنت یعنی حیدرآباد کی وسعت کا اندازہ ایک ممتاز مورخ گردھاری لال احقر کی تصنیف "تاریخ ظفرہ" سے جو معلوم ہوتی ہے وہ اس طرح ہے:

"دارالسلطنت حیدرآباد ــــ ابراہیم پٹن، بھونگیر اور پٹن چیرو تک چار جانب پھیلا ہوا ہے۔ اس کی مسافت دس فرسنگ ہے۔ اس طویل رقبے میں بکثرت باغات، مساجد، منادر، سرائے بستیاں بنے ہوئے ہیں۔" افسوس ہے کہ ہم کو اس زمانے کی مردم شماری کا علم نہیں ہے لیکن اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آٹھ نو لاکھ سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔

حیدرآباد میں قطب شاہی دور کی جو نادر عمارتیں اب بھی اپنی شان و عظمت کو باقی رکھے ہوئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ چارمینار، جو محمد قلی کے عہد میں تعمیر ہوا۔

۲۔ جامع مسجد، اس کے ساتھ طلبا کے رہنے کے لیے کمرے بھی تعمیر کیے گئے تھے جو طلب چارمینار کے مدرسے میں تعلیم پاتے وہ یہاں قیام پذیر ہوتے۔ چارمینار کے ساتھ ہی جامع مسجد کی تعمیر ہوئی تھی۔ اب اس مسجد کو جامع مسجد چارمینار کہا جاتا ہے۔

۳۔ مکّہ مسجد جس کی تعمیر سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۲۲ھ میں شروع ہوئی دو ہزار معمار و سنگ تراش اور چار ہزار سے زائد مزدور شب و روز کام کرتے رہتے تھے۔ میر فیض اللہ صاحب اس کی نگرانی فرماتے تھے۔ اور رنگیا چودھری المخاطب ہنرمند خاں انجینئر تھے۔ تین بادشاہوں، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا اور بالآخر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ۱۱۰۴ھ میں مکّہ مسجد کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

۴۔ چاروں کمانیں جو اندرونِ شہر باقی ہیں یہ دراصل شاہی محل دولت خانۂ عالی کے دروازے تھے۔

۵۔ گلزار حوض۔ جو چار کمانوں کے بیچوں بیچ بنایا گیا تھا آصفی دور میں کئی مرتبہ توڑا اور بنایا گیا۔ آج یہ جدید طرز پر متوسط سائز میں بنا ہوا ہے۔

۶۔ بادشاہی عاشور خانہ۔ جس کی تعمیر ۱۰۰۳ھ میں ہوئی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں چینی کی نقاشی کی گئی۔ اس کے باب الداخلہ کے اطراف ٹاڈ بیٹریوں کا بہت بڑا کاروبار ہے جس میں فوجی لباس وغیرہ فروخت ہوتے ہیں۔

۸۶۶۔۳۔۲۰، رحیم منزل۔ شاہ گنج۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲

تالاب ماں صاحب ۔ جس کو سلطان
بداللہ قطب شاہ کی والدہ حیات بخشی بیگم نے
ے پلی اور خیریت آباد کی آبادی اور اراضی کی
یرابی کے لیے بنایا ۔ اب اس کے اطراف
رکاری دفاتر، بازار اور اوینڈرا بھارتی تھیٹر
ائم ہے ۔

مسجد خیریت آباد جو ابراہیم عادل شاہ
ی یادگار ہے ۔

گوشہ محل کا حوض ۔ جو گوشہ محل اسٹیڈیم
ے موسوم ہے اور بارہ دری جو ابوالحسن تانا شاہ
ے زمانے کی یادگاریں ہیں ۔

باغ لنگم پلی ۔ عبداللہ قطب شاہ کے
ے زمانے میں تعمیر ہوا تھا ۔

باغ امین الملک جو آج کل وسیع و
ریض زنانہ دواخانہ وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل ہے ۔

دارالشفا کے کھنڈر ۔ یہ عمارت عبداللہ
طب شاہ کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی ہزارہا
ریض یہاں داخل رہتے تھے حکومت کی جانب
ے دوا اور غذا کا مفت انتظام ہوتا تھا ۔ ممتاز
طبا شب و روز مریضوں کے معالجے میں مصروف
ہتے تھے ۔ اس کے قریب ایک شاندار عمارت
عزا خانہ زہرا" کے نام سے بنی ہوئی ہے جو
اہ محرم الحرام میں اہل تشیع حضرات کا مرکز بنا رہتا
ہے ۔ اس عمارت سے متصل ایک اور عمارت ہے
و میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد کہلاتی تھی
ج اس میں قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی
اصدر دفتر قائم ہے ۔

قطب شاہی ایوان دولت خانہ عالیہ کا
م و نشان بھی اب باقی نہیں ۔ اسی طرح ندی محل
ل کوہ طور اور دوسرے شاہی محلات اور
غات معدوم ہو چکے ہیں ۔ شہزادہ کام بخش کا محل جو "اردوئے معلّٰی" کہلاتا تھا باقی نہیں ہے البتہ اس جگہ " اُردو گلی ترپ بازار " کے نام سے ایک محلہ آباد ہے ۔

موجودہ حیدرآباد کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ ایک تو وہ حصہ جو قلعہ گولکنڈہ سے موسوم ہے اور آج بھی ایک فصیل کے اندر واقع ہے اس میں آصف نگر، مہدی پٹنم، لنگر حوض بیرن فرسٹ لانسرز ٹولی چوکی وغیرہ کی آبادیاں بھی شامل کی جا سکتی ہیں ۔ دوسری آبادی موسیٰ ندی کے جنوب کی آبادی ہے جس کو قدیم اصطلاح میں " اندرونِ شہر " کہا جاتا تھا ۔ کیونکہ یہ آبادی ایک پختہ فصیل کے اندر تھی اور آبادی میں جانے کے لیے بارہ دروازے بنے ہوئے تھے ۔ کچھ نام اس طرح ہیں :

۱ ۔ دہلی دروازہ (قریب نیا پُل)
۲ ۔ پُرانے پُل کا دروازہ، جس کے قریب اہلِ ہنود کی عظیم مسان گھٹی ہے ۔
۳ ۔ چادر گھاٹ کا دروازہ ۔
۴ ۔ یاقوت پورہ کا دروازہ ۔
۵ ۔ دبیر پورہ کا دروازہ ۔
۶ ۔ فتح دروازہ ۔
۷ ۔ گولی پورہ کا دروازہ ۔
۸ ۔ علی آباد کا دروازہ ۔
۹ ۔ دودھ باؤلی کا دروازہ ۔

ان دروازوں پر اب بڑے بڑے محلّے آباد ہیں ۔ اور اطراف میں بڑے بڑے بازار لگے ہوئے ہیں ۔ تیسری آبادی موسیٰ ندی کے شمال کی جانب کی ہے جس کو ایک زمانے میں چادر گھاٹ سے موسوم کیا جاتا تھا ۔ یہ آبادی قطب شاہی دور میں چند دیہات پر مشتمل تھی ۔ آصفی دور میں اس آبادی کو بہت زیادہ وسعت حاصل ہو گئی ۔ شمال میں سکندرآباد ہے جہاں ریاست کا عظیم الشان ریلوے اسٹیشن ہے ۔ بیگم پیٹ جہاں ہوائی اڈہ ہے امیر پیٹ صفدر نگر تک اور مشرق میں عنبر پیٹ سے جامعہ عثمانیہ، سرور نگر تک حیدرآباد کی آبادی پھیل گئی ہے ۔ اسی طرح مغرب میں اس کا سرا گولکنڈہ کی آبادی سے جا ملا ہے ۔ حیدرآباد کی چوتھی آبادی سکندرآباد آلوال، بولارم، لالہ گوڑہ، سیتا پھل منڈی وغیرہ کی ہے ۔ حیدرآباد کی آبادی میں مسلمان، ہندو، برہمن، کائستھ، ریڈی، مارواڑی، سکھ، جین، پارسی، عیسائی، یہودی وغیرہ بھی شامل ہیں اور صدیوں سے مل جل کر رہتے آئے ہیں ۔

حیدرآباد کی تاریخ میں قلعہ گولکنڈہ کو جو اہمیت حاصل ہے اس پر تھوڑی گفتگو ضروری ہے ۔

قلعہ گولکنڈہ کی آبادی آج بھی ایک محفوظ فصیل کے اندر ہے اور کئی دروازے ایسے ہیں جن سے گزرنا ہوتا ہے ۔ قلعہ گولکنڈہ سے متصل جو آبادی قلعے کے باہر ہے وہ لنگر حوض کہلاتی ہے اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ قطب شاہی دور میں یہاں ہاتھی باندھے جاتے تھے ۔ ہاتھیوں کے باندھنے کی مضبوط زنجیر لنگر سے موسوم تھی ۔ ہاتھیوں کے پانی پینے اور انہیں نہلانے کے لیے ایک بڑے حوض یا کنڈ کی ضرورت تھی ۔ چنانچہ قلعے کے باہر ایک تالاب بنایا گیا ۔ اس طرح یہ مقام لنگر حوض کے نام سے موسوم ہو گیا ۔ لنگر حوض سے شہر کی طرف آئیں تو آصف نگر (مہدی پٹنم) کی آبادی ہے جو آصف جاہ ثانی کے زمانے میں بسائی گئی تھی ۔ اور یہاں ایک باغ بنام زیبا باغ تعمیر ہوا تھا ۔ یہ باغ آج تک موجود ہے ۔ اور جناب سیّد لطیف الدین قادری صاحب اور جناب سیّد وقار الدین

صاحب' مدیران روزنامہ رہنمائے دکن کی ملکیت ہے۔ قلعے سے دوسری طرف یعنی ماں صاحب کے تالاب کی طرف آئیں تو تالاب سے پہلے "سروجنی دیوی آئی ہاسپٹل" اور گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبا کی ٹریننگ کی درسگاہ "گورنمنٹ کامپریہنسیو کالج ایجوکیشن ماں صاحب ــــ" واقع ہے، یہیں بیرن کا محلہ ہے۔ یہاں زمانۂ قدیم میں بیروں کے درخت بکثرت تھے۔ اس لیے بیرن سے موسوم ہو گیا۔ بیرن سے متصل فرسٹ لانسرز اور ہمایوں نگر کی آبادی ہے۔ جو سرکار نظام کی فرسٹ لانسرز کے رسالے کے قیام کے باعث اس نام سے موسوم ہوئی۔ باقی نہیں ہے مگر نام رہ گیا ہے۔ اسی طرح ہمایوں نگر سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کا بسایا ہوا ہے۔ موصوف حیدرآباد کے ایک ممتاز بیرسٹر تھے انھوں نے ایک بڑی زمین حاصل کر کے وہاں آبادی بسائی اور اسے اپنے نام سے موسوم کیا۔ سید ہمایوں مرزا صاحب کی اہلیہ محترمہ صغرا بیگم صاحبہ نے حیدرآباد میں مصنف، شاعرہ اور سماجی قائد کی حیثیت سے قابلِ ذکر خدمات انجام دیں۔ قلعہ گولکنڈہ کے دوسری طرف جائیں تو ٹولی چوکی اور گنبدوں کی آبادی ملتی ہے۔ شہر میں داخل ہونے والے سامان پر اس زمانے میں جو محصول لیا جاتا تھا اس کے وصول کرنے والے جس مقام پر ہوتے اس کو "چوکی" سے موسوم کرتے تھے اس لیے یہ جگہ ٹولی چوکی کہلائی۔ عہدِ قدیم میں پیسے سے کم قیمت کا سکہ ٹولی کے نام سے رائج تھا۔ کوڑی کا بھی رواج تھا جو آج بند ہے۔

گولکنڈہ کے متصل سلاطینِ گولکنڈہ کے مقبرے ہیں ایک ساتھ پورے خاندان کے مقبرے کسی مقام پر اور کسی شہر میں نہیں ہیں۔ گولکنڈہ کے بادشاہوں کی یہ خصوصیت رہی کہ ان کے مقبرے ایک ہی جگہ واقع ہیں سلطان قلی قطب شاہ ابراہیم قلی قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے مقبرے خصوصیت کے ساتھ آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے دیکھنے کے قابل ہیں۔ خاص طور پر چاندنی راتوں میں یہاں کا خاموش سماں دل پر ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے چونکہ گولکنڈہ کے آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تاناشاہ کو اورنگ زیب عالمگیر نے یہاں سے منتقل کر دیا تھا اس لیے ان کا مقبرہ خلدآباد میں ہے۔

بقول محترمہ شفیق النساء رومینہ صاحبہ شہر حیدرآباد صرف تہذیب کا گہوارہ نہیں بلکہ تہذیبوں کا سنگم بھی ہے۔ یہاں کے در و دیوار نے نہ جانے کتنے عروج و زوال کے مناظر دیکھے قطب شاہوں کے عہد میں امرا و رؤسا کی عظمت و شان و شوکت، بادشاہوں کا رعب و جلال اور عوام کی امیدوں و آرزوؤں کی کہانیاں مغلیہ دور میں اور آصف جاہوں کے عہد میں ہزاروں لاکھوں انسان اپنے ماتھے پر تردد کے نقوش لیے ہوئے ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ یہاں ہندوستان کے ہر حصے سے لوگ آئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر سے لوگ آئے اور اپنے اپنے رسم و رواج بھی ساتھ لائے اور یہاں کی فضا میں رچ بس گئے۔

میکش اجمیری

کیا بتائیں کہ کس قدر چاہا
آپ کو ہم نے ٹوٹ کر چاہا

عشق کے خانماں خرابوں نے
جب بھی چاہا ہے تیرا در چاہا

جب تھکن نیند بن کے منڈلائی
یری آوارگی نے گھر چاہا

یکھ کر حادثات کی یورش
ہر مسافر نے ہم سفر چاہا

ہم نے آنکھوں کی رونقوں کے لیے
شک پلکوں پہ اشکِ تر چاہا

موتی بازار، نماہیڑہ، راجستھان ۳۱۲۶۰۱

بکھرتے ٹوٹتے رشتے، عذاب ہجرت کے
مٹا رہے ہیں دلوں سے نقوش الفت کے

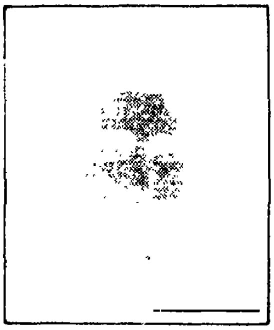
وہ آج ہو گئے اک انقلاب میں تبدیل
جو گیت گائے تھے میں نے کبھی بغاوت کے

توہمات کے اندھے کنویں کی نذر ہوئے
چہار سمت اجالے جو تھے بصیرت کے

گزرتے وقت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر
کرشمے دیکھتا رہتا ہوں میں سیاست کے

الٹ گئی نہ ہو بیتاب اعافیت کی بساط
بکھر رہے ہیں نگاہوں میں عکس حیرت کے

عبدالحق بیتاب



جولا ساہی، کٹک ۷۵۳۰۰۱

انور حسین انور

سنگِ احساس کٹا تیشۂ لب سے پہلے
کیسے گزرے ہیں زیاں عرضِ طلب سے پہلے

اب سماعت بھی گوارا نہیں کرتی اس کو
وہ جو اک نام تو لیتا تھا ادب سے پہلے

جو بچھڑ جاتا ہے پھر کب وہ یہاں ملتا ہے
صبح کا دھیان ہے اندیشۂ شب سے پہلے

اپنی قیمت ہوئی معلوم تو محدود ہوئے
ورنہ خوشبو کی طرح لوگ تھے اب سے پہلے

صرف کردار ہی وہ چیز ہے جس کو انور
لوگ پہچانتے ہیں نام و نسب سے پہلے

۱۰۰، چھتہ علی رضا، میرٹھ (یو۔پی)

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام

منظر

پُرانی دلّی کی ایک بستی میں رام دھن ایک وطن پرست کے گھر کا کُھلا صحن ہے۔ صحن میں آم کے درخت کے نیچے، رام دھن عمر ۶۰۔ ۶۲ سال چارپائی پر غمگین صورت بنائے بیٹھا نظر آرہا ہے، یونہی اخبارات کے اوراق الٹ پلٹ کرتا ہوا قریب ہی ایک حقہ بھی رکھا ہوا ہے جو اس وقت ٹھنڈا ہے۔ رام دھن گاہے گاہے باہر گلی میں آتے جاتے لوگوں پر بھی نگاہ ڈال لیتا ہے۔ لیکن کافی پریشان حال اور بے چین سا نظر آتا ہے۔ گھر کے دائیں طرف کریم بخش رہائش پذیر ہے۔ جبکہ اس کے گھر کے بائیں جانب ایشر سنگھ رفیوجی کا گھر ہے

پردہ اٹھتے وقت:

رام دھن کی بیوی کرپی، عمر ۵۰/ ۵۲ سال۔ اپنے گھر سے آوازیں لگاتی ہوئی باہر صحن میں آتی ہے۔ رام دھن نے کمبل لپیٹ رکھا ہے۔ اس کی آنکھوں پر عینک ہے۔ اس نے معمولی قسم کا لباس پہن رکھا ہے۔ یعنی دھوتی، کُرتا نہرو جیکٹ اور سر پر کھادی کی پگڑی بھی باندھ رکھی ہے۔

کرپی: اجی سُنتے ہو؟ اب اندر کیوں نہیں آجاتے؟ اب تو دن بھی ڈھل چکا ہے اور سرد ہوا بھی چلنی شروع ہو گئی ہے۔

رام دھن: ہاں... ہاں، آجاؤں گا اندر بھی۔ مگر اندر آکر بھی کیا کروں گا؟

کرپی: (ایک اسٹول پر بیٹھتی ہوئی) اجی۔ بات کیا ہے؟ آج تو حقہ بھی نہیں گرم کیا تم نے؟ کچھ ڈھیلے ڈھالے سے لگ رہے ہو؟

رام دھن: ہاں کرپی، تو ٹھیک کہتی ہے آج دل بے چین سا ہو رہا ہے۔ نہ معلوم کیوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔

کرپی: (بھرائی آواز میں) آج پھر رام پرساد کی یاد آگئی ہے کیا؟

رام دھن: ہاں کرپی۔ رام پرساد بیٹا مجھے بھول بھی کیسے سکتا ہے؟ اور ہندستان بھر کے دیگر ہزار ہا بیٹے۔ جو آزادی کی جدوجہد کے دوران آزادیٔ وطن کے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو گئے۔ آج کل مجھے بہت یاد آتے ہیں ہر لمحے:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

کرپی: پھر بھی تمھیں تو خوش ہونا ہی چاہیے نا۔ کیونکہ اب ہمارا وطن آزاد ہے۔ مگر کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے تمھیں کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ تم میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی میں نے؟

رام دھن: (عینک کے شیشے صاف کرکے دوبارہ عینک لگاتے ہوئے) تم درست کہتی ہو کرپی۔ بلاشک تم درست کہتی ہو کہ ہمارا وطنِ عزیز آزاد ہے۔ پندرہ اگست سے جب سے قلعے پر پنڈت جواہر لال نہرو نے ترنگا لہرایا۔ دلّی بھر کے لوگ مارے خوشی کے پاگل ہو اٹھے تھے۔ کرپی، خوش تو مجھے بھی ہونا چاہیے تھا۔ مگر میں خوش نہیں ہو سکا۔ ہمارا باپو مہاتما گاندھی بھی دل سے خوش نہیں ہے۔

کرپی: یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ باپو جی دل سے خوش نہیں ہیں کیا؟

رام دھن: نہیں کرپی۔ مجھے یہ بات میرے لیڈر نے بتلائی تھی۔ باپو کا دل تو ابھی تک خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اگرچہ ملک کو آزاد ہوئے بھی ساڑھے پانچ ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔

کرپی: مگر...؟ بات تو حیرانی کی ہے؟

رام دھن: کرپی۔ ہندستان آزاد تو ضرور ہوا ہے۔ مگر باپو کے خوابوں کا ہندستان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ تم خیال کرو کرپی، کتنا خون بہا ہے؟ کتنے گھر نذرِ آتش ہوئے ہیں۔ اور یہ آزادی ہمیں کتنی مہنگی پڑی ہے؟ کتنی بھاری قیمت ہم نے ادا کی ہے۔ لاکھوں لوگ گھر بار سے اجڑ گئے، اور زندہ جلا دیے گئے۔ عورتیں، بچے، نوجوان، بوڑھے، ہندو، مسلم، سکھ اور پھر لاکھوں لوگ اُجڑ کر شرنارتھی بن کر رہ گئے۔ کنگزوے کیمپ، پُرانا قلعہ اور دیگر جگہوں پر سر چھپانے کے لیے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

کرپی: (مایوسی کے عالم میں) ہے رام کیسی کیسی مُصیبتیں نازل ہوتی ہیں ہمارے بھائیوں پر، بہنوں پر، بوڑھوں اور بچوں پر؟

رام دھن: بھئی آزادی تو ہم نے

122/4-J، راجوری گارڈن، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷

مانگی تھی۔ وطن کے لوگوں کی خوشحالی کے لیے۔ یہ بربادی تو ہمیں درکار نہ تھی ؟ اس کی تو ہم نے تمنا نہ کی تھی ؟ کیمپوں میں جب میں کمسن بچوں اور بوڑھی عورتوں کو دیکھتا ہوں ایک ایک روٹی کو ترستے ہوئے ۔ تو میں خون کے آنسو بہاتا ہوں۔ کرپی، خون کے آنسو۔

کرپی : اسی آزادی کی خاطر ہمارے بھی لختِ جگر نے . . . اپنا سینہ چھلنی کروا لیا تھا۔

رام دھن : ہاں کرپی ایک رام پرساد کیا لاکھوں ماؤں کے لختِ جگر جو اپنی جان پر کھیل گئے۔

کرپی : دیکھو جی بٹوارہ تو جو ہوا سو ہوا ہی۔ مگر یہ فرقہ وارانہ فسادات اور خانہ جنگی ہرگز نہ ہونی چاہیے تھی۔

رام دھن : کرپی، باپو نے از حد کوشش کی تھی فسادات کو رکوانے کی۔ مرن برت تک رکھے ہیں انھوں نے۔ وہ نوا کھالی، کلکتہ، ڈھاکہ۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں گھومتے رہے ہیں۔ انھوں نے خدا، بھگوان اور واہگورو کے نام کے واسطے بھی دیے ہیں۔ مگر افسوس لوگوں کے دماغوں پر ایسی وحشت اور مذہبی جنون سوار ہوا ہے کہ انھوں نے باپو کی بھی ایک نہیں سُنی۔ کرپی، کتنی افسوسناک بات ہے۔ کتنے رنج کی بات ہے۔ ایک گھر کے بچے اپنے ہی بزرگ کی بات تک نہ سُنیں۔ ہے کہ نہیں ؟

کرپی : اجی کبھی کبھار باپو کی پرارتھنا سبھا میں ہی شامل ہو جایا کرو۔ اس طرح اپنے پرانے ساتھیوں سے بھی میل جول ہو جایا کرے گا اور تمھارے دل کا بوجھ بھی کچھ کم . . .

رام دھن : (سرد آہ بھر کر اور باہر کی طرف دیکھتے ہوئے) کرپی کیا بتاؤں؟ باپو تو خود ٹوٹا ہوا ہے۔ تم ذرا خیال کرو۔ باپو عمر بھر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی تمام مذاہب کے لوگوں کو اتحاد کی تلقین کرتا رہا ہے۔ مگر لوگوں نے اُلٹے خون کے دریا بہا دیے۔ کتنی بے عزتی کی ہے ہم ہندستانیوں نے اپنے باپو کی ؟ اس عظیم انسان کی۔ ہم نے تو باپو کے خوابوں کو چکنا چُور کر کے رکھ دیا ہے اور اب باپو بیچارے کے پاس رہ ہی کیا گیا ہے؟ کچھ کہنے سُننے کے لیے ؟

کرپی : یہ تو سچ کہتے ہو۔

رام دھن : کچھ دن پہلے میں نے باپو کو ایک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے سُنا تھا۔ کیا بتاؤں کرپی۔ باپو کی زبان رُک رُک جاتی تھی۔ درحقیقت باپو کا دل ٹوٹ چکا ہے اُس کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اس غیر قدرتی بٹوارے پر اس کی روح کتنی دُکھی ہے اِس انسانیت کے بٹوارے پر اب میں کیا بتاؤں؟

کرپی : بات تو ٹھیک ہی کہتے ہو تم۔

رام دھن : مجھے تو . . . مجھے تو اب یوں محسوس ہوتا ہے کرپی کہ باپو زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اتنا عظیم صدمہ وہ کب تک برداشت کرے گا۔

کرپی : ہے رام، بھگوان کرے باپو کو کچھ نہ ہو۔ اُس کا سایہ برسوں تک ہمارے سر پر رہے۔

رام دھن : مگر مجھے ایسا دکھائی نہیں پڑتا۔ میں نے اپنے ہی لوگوں کو باپو کے برخلاف زہر اگلتے ہوئے سُنا ہے۔ کرپی، میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ کچھ لوگ باپو کے خلاف کیسی کیسی بیہودہ باتیں کرتے ہیں۔

کرپی : کیا کہتے ہیں وہ لوگ ؟

رام دھن : بس اکثر یہ الزام تراشی کی جاتی ہے کہ باپو مسلمانوں کو اپنی بغل میں چھپائے پھرتا ہے۔ اور یہ لوگ اب پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔

کرپی : ہائے رام یہ تو اور بھی بُری بات ہے۔

رام دھن : ان عقل کے اندھوں کو یہ نہیں معلوم کہ ہمارا بھارت ایک سیکولر دیش کہلاتا ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی کا وطن ہے یہ۔ یہاں ہم سب نے مل جُل کر رہنا ہے۔ بھائیوں کی مانند۔ اور اس کو خوشحالی کی راہ پر لے جانا ہے۔ اس کٹے پھٹے وطن کو پھر سے جوڑنا ہے۔

کرپی : مگر جو لوگ ان باتوں سے متفق نہیں ہیں۔ ان کو کون سمجھائے گا۔ کون لائے گا ان کو سیدھے راستے پر؟

رام دھن : مجھے تو از حد افسوس ہوتا ہے۔ اپنے ہی بھائیوں کی عقل پر۔ اُف کتنا زہر چڑھ گیا ہے ان کے دماغوں میں؟ مجھے تو کرپی اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب ہمارے وطن میں ہندو، مُسلم اور سکھ ہی رہ گئے ہوں اور ہندستانی کوئی نہ رہ گیا ہو اور اگر ہندستانی ہی نہیں تو ہندستان کیسا؟ ہاں . . . ہاں ہند ستان کیسا؟

کرپی : اجی، باپو نے تو ہمیں ہندستانی ہونے پر ہی فخر کرنا سکھایا ہے۔

رام دھن : بٹوارے نے ہمارے آدرش کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دی ہیں۔ اور ہمارے چہروں پر تحریر کر دیا گیا ہے کہ ہم ہندو، مسلم، اور سکھ وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ہر آدمی بس اپنے

مذہب کے بارے میں ہی سوچا ہے۔ انسانیت کے بارے میں سوچنا تو جیسے لوگ بھول ہی گئے ہوں۔ کتنا ہولناک انجام ہے؟ اُف!

کرپی: آخر کون سے رستے پر گامزن ہیں۔ ہمارے لوگ؟

رام دھن: اگر اس کٹے پھٹے ہندستان نے ترقی کی منزلیں طے کرنی ہیں تو ہم سب کو صرف ہندستان کے بارے میں ہی سوچنا ہوگا۔ اور اپنے آپ کو ہندستانی سمجھنا ہوگا۔ یہی پیغام ہے باپو کا۔

کرپی: اجی دیکھیے، ہم لوگوں کی یادداشت کتنی کمزور پڑ گئی ہے۔

رام دھن: (کمبل کو پیٹتے ہوئے) وہ تو ہے ہی۔ ہم لوگ مذہب کے نام پہ فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ میں تو ایسے لوگوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ ہم نے شمع آزادی کے اُن پروانوں کے ساتھ غداری کی ہے جنھوں نے وطن کی آزادی اور ایکتا کے لیے جانوں کی بازی لگا دی... جلیانوالہ باغ میں بہنے والا خون۔ آئی۔ این۔ اے کے بہادر نوجوانوں کا خون اور ان مجاہدوں کی قربانیاں جو جزائر انڈیمان میں فرنگیوں کی سختیاں جھیلتے جھیلتے ملک عدم کو روانہ ہو گئے۔ کرپی۔ کیا ہم اُن شہید سورماؤں کے آگے اپنا سر اُٹھا سکتے ہیں؟ نہیں... ہرگز نہیں ... ہرگز نہیں۔

کرپی: اجی نہ جلاؤ دل کو۔ چلو اندر چلتے ہیں اب تو سورج بھی غروب ہو چکا ہے۔ اور سردی بھی کچھ...

رام دھن: کرپی میں جب سے رفیوجی کیمپوں سے ہو کر آیا ہوں۔ میرے دل کی بے چینی اور بڑھ گئی ہے۔ انسان کی بربریت اور درندگی کا جیتا جاگتا منظر میں نے دیکھا ہے وہاں۔

کرپی: (سرد آہ بھر کر) بھگوان بخشے ہمارے گناہ۔

رام دھن: ہوں! کرپی ہم نے اتنے بڑے گناہ کیے ہیں کہ بھگوان بھی بخشنے سے پہلے ہزار بار سوچے گا۔ میں کہتا ہوں آخر کون سا گھر ہے جس کے لوگ قتل نہیں ہوئے یا زندہ نذرِ آتش نہیں کیے گئے؟ یا جن کی بہو بیٹیوں کی عصمت دری نہیں کی گئی؟ باپو ہندستان بھر میں انسانیت کی آواز بن کر چیخ چیخ کر تھک گیا ہے۔

(رام دھن رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتا ہے)

کرپی: اجی تم مغربی پنجاب اور دیگر علاقوں کی بات چھوڑ دو۔ ہمارے لوگوں نے یہاں دلی میں کیا کچھ نہیں کیا؟ وہی بات واگھہ کے اُس پار انھوں نے کی۔ ہمارے لوگوں نے ادھر کر دکھلائی ہے۔ جیسے وحشی وہ لوگ نکلے۔ ایسے ہی وحشی ہم لوگ بن گئے۔ کیا کس نے کی ہے؟ مگر لُٹے مرے بے قصور لوگ ہی۔ دونوں طرف بیچارے۔

رام دھن: کرپی وقت آئے گا جب ہم لوگ اپنے کرتوتوں پر پچھتائیں گے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ فرنگی نے تو ہمیں لڑانا ہی تھا مگر ہماری عقل کوئی گھاس چرنے تو نہیں چلی گئی تھی کہ ہم لوگ اُن کی تانوں پر ناچنے لگ گئے؟ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ درحقیقت شیطانیت ہمارے اندر پہلے سے ہی موجود تھی۔ فرنگیوں نے تو بارود کو فلیتہ دکھایا تھا ایک دوسرے کو اُکسا کر۔ مذہبی جذبات کو بھڑکا کر۔ ہر طرح کا لالچ دے کر۔

کرپی: چلو، اب اُٹھو بھی۔ اندر بیٹھ کر چائے کا پیالہ پیتے ہیں۔ اور میں کہتی ہوں تم ناحق اپنا خون مت جلایا کرو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب وطن کے نوجوان جانیں اور ان کا کام۔

رام دھن: اگر وطن کا یہی حشر ہونا تھا تو ہم لوگ فرنگیوں کی لاٹھیاں اور گولیاں کس لیے کھاتے رہے؟ میں کہتا ہوں ہم اپنی زندگیاں کس لیے داؤں پر لگاتے رہے؟

(اسی لمحے ایک نوجوان رام لعل دوڑتا ہوا اندر آتا ہے۔ اُس کا سانس قدرے پھول رہا ہے)

رام لعل: (ہانپتا ہوا) لالہ جی سُنا تم نے کچھ؟

رام دھن: ارے کیا بات ہے رام لعل؟ خیر و عافیت تو ہے؟ کہیں دنگا فساد تو نہیں ہو گیا؟

رام لعل: (پہلے کی مانند ہی ہانپتا ہوا) لوگ بازار میں باتیں کر رہے ہیں کہ باپو کو... !

رام دھن: (چونک کر) کیا ہوا، باپو کو...؟

رام لعل: باپو کو گولی مار دی گئی ہے...

رام دھن: کیا کہا؟ باپو کو...؟ گولی مار دی گئی ہے؟

(رام دھن ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چارپائی پر یوں بیٹھتا ہے جیسے اس کا سر چکرا گیا ہو)

کرپی: یہ کیا کہہ رہا ہے بیٹا؟ یوں نہ کہہ۔ بھگوان کرے۔ یہ سب جھوٹ ہو...

جھوٹ ہو۔

(کرپی روتی ہوئی کمرے کی طرف چل دیتی ہے۔ اسی لمحے کریم بخش اور ایشر سنگھ بھی اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں)

ایشر سنگھ: (گھبرائی ہوئی آواز میں) ارے او رام دھن، کیا ہوا بھئی؟

کریم بخش: ارے رام لعل کیا یہ خبر سچی ہے۔ یا بس افواہ بھر ہے؟

رام لعل: چاچا! سارے بازار میں یہ خبر گشت کر رہی ہے۔ ذرا گھر کے آنگن سے باہر نکل کر تو دیکھیے۔ لوگ کیسے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں؟ بازار بند ہو گئے ہیں اور پولیس کی گاڑیاں بھی اِدھر اُدھر بھاگی جا رہی ہیں۔

(تمام لوگ چارپائی اور اسٹول وغیرہ پر بیٹھے ہیں اور ان کے چہروں پر ایک تناؤ سا دکھائی دیتا ہے)

کریم بخش: یا اللہ اس فقیر نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ اس کی نظر میں تو کوئی ہندو تھا نہ مسلمان۔ وہ تو سبھی کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ایشر سنگھ: گھور کلجگ ہے بھائی کریم بخش۔ مہاتما جی تو عمر بھر عدم تشدد کا پرچار کرتے رہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران بھی جب انھوں نے دیکھا کہ تشدد پاؤں پھیلانے لگا ہے تو فوراً ستیہ گرہ واپس لے لیا اور آج آزاد ہندستان میں۔ ۔ ۔ ہے واہگورو تو ہی بخشے گا ہمارے گناہ۔

رام دھن: (آنسو پونچھتا ہوا) ٹھیک بات تو یہ ہے بھائی کہ مجھے تو آدمی سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ اب ہم لوگ کیسے سر اونچا کر کے چل سکتے ہیں؟ ہے بھگوان یہ کیا ہو گیا؟ اُف۔ میں تو باپو جی کے آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ میں جانے کے بارے میں سوچتا ہی رہا۔

ایشر سنگھ: (کچھ گھبراہٹ سے) مگر رام لعل یہ کم بخت ہے کون؟ جس نے مہاتما جی کی جان لی ہے؟

رام لعل: چاچا! لوگ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کسی رفیوجی کا کام ہے۔

ایشر سنگھ: (یکدم کانپ کر) رفیوجی؟ ہے واہگورو یہ بات غلط ہو۔ ہم لوگ تو رام دھن جی پہلے ہی لُٹ پٹ کر آئے ہیں۔ ہے واہگورو یہ کلنک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر مت لگانا۔ ہم تو وطن کی خاطر بھاری قیمت چکا کر آئے ہیں۔

کریم بخش: یا اللہ کہیں۔ ۔ ۔ کہیں۔ ۔ ۔؟

(اندرونی خوف سے کانپ اُٹھتا ہے)

رام دھن: پچھلی بار جب میں برلا ہاؤس میں پرارتھنا سبھا میں شمولیت کے لیے گیا تھا تو پولیس والے ہر ایک کی تلاشی لے رہے تھے۔

ایشر سنگھ: اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس کو اس بات کا پہلے سے ہی اندیشہ تھا کہ کوئی شخص مہاتما جی کی زندگی ختم کرنے پر آمادہ ہے۔ ۔ ۔ ہے نا؟

کریم بخش: اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر کیا اچھا ہوتا کہ ایسے فرشتہ سیرت انسان کو بچا لیا جاتا۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔

ایشر سنگھ: عین ممکن ہے کہ کوئی دل جلا کوئی ہمارا رفیوجی بھائی ہی ہو۔ جس کے گھر کے سبھی لوگ قتل ہو گئے ہوں۔ اور وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہو؟ کیوں لالہ رام دھن:

رام لعل: (بات کاٹ کر) بات تو یہی ٹھیک لگتی ہے۔ باپو نے کہا تھا نا کہ میں وطن کی تقسیم ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ چاہے میری زندگی ہی یوں نہ چلی جائے۔

کریم بخش: ہاں۔ ۔ ۔ ہاں باپو تو یہ بھی اعلانیہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان اس کی نعش پر بنے گا۔

رام دھن: درست ہے۔ مگر کریم بخش حالات نے ایسا روپ دھارا کہ باپو بیچارا مجبور ہو کر رہ گیا تھا۔ لاچار اور بے یار و مددگار سب کچھ دیکھتا رہا بس دیکھتا رہا۔

رام لعل: میں نے تو کئی لوگوں کو خوش ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے ابھی۔

ایشر سنگھ: (چونک کر) کیا کہا! باپو کی شہادت پر۔ ۔ ۔؟

رام دھن: ایسے لوگ انسانیت سے گرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ احسان فراموش۔ ایسے لوگوں پر ہزار بار لعنت ہے۔ ۔ ۔ ہزار بار لعنت۔

کریم بخش: (باہر کی طرف جھانک کر) ارے بھئی۔ وہ دیکھو کانشی رام تھانیدار آ رہا ہے۔ اُسے ذرا آواز دو۔ اس سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا ہوا ہے!

ایشر سنگھ: (باہر جا کر) اجی چوپڑہ صاحب ذرا تشریف لانا اِدھر بھی۔

(کچھ وقفے کے بعد کانشی رام چوپڑہ تھانیدار، جو ایک بارعب شخصیت کا مالک ہے اندر آتا ہے۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور تھکاوٹ ظاہر ہے۔ عمر ۳۰ برس کے قریب ہے)

مذہب کے بارے میں ہی سوچتا ہے۔ انسانیت کے بارے میں سوچنا تو جیسے لوگ بھول ہی گئے ہوں۔ کتنا ہولناک انجام ہے؟ اُف!

کرپی: آخر کون سے رستے پر گامزن ہیں۔ ہمارے لوگ؟

رام دھن: اگر اس کٹے پھٹے ہندستان نے ترقی کی منزلیں طے کرنی ہیں تو ہم سب کو صرف ہندستان کے بارے میں ہی سوچنا ہوگا۔ اور اپنے آپ کو ہندستانی سمجھنا ہوگا۔ یہی پیغام ہے باپو کا۔

کرپی: اجی دیکھیے، ہم لوگوں کی یادداشت کتنی کمزور پڑ گئی ہے۔

رام دھن: (کمبل کو لپیٹتے ہوئے) وہ تو ہے ہی۔ ہم لوگ مذہب کے نام پر فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ میں تو ایسے لوگوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ ہم نے شمع آزادی کے اُن پروانوں کے ساتھ غداری کی ہے جنھوں نے وطن کی آزادی اور ایکتا کے لیے جانوں کی بازی لگا دی... جلیانوالہ باغ میں بہنے والا خون۔ آئی۔ این۔ اے۔ کے بہادر نوجوانوں کا خون اور ان مجاہدوں کی قربانیاں جو جزائر انڈیمان میں فرنگیوں کی سختیاں جھیلتے جھیلتے ملک عدم کو روانہ ہو گئے۔ کرپی۔ کیا ہم اُن شہید سورماؤں کے آگے اپنا سر اُٹھا سکتے ہیں؟ نہیں... ہرگز نہیں ... ہرگز نہیں۔

کرپی: اجی نہ جلاؤ دل کو۔ چلو اندر چلتے ہیں اب تو سورج بھی غروب ہو چکا ہے۔ اور سردی بھی کچھ...

رام دھن: کرپی میں جب سے رفیوجی کیمپوں سے ہو کر آیا ہوں۔ میرے دل کی بے چینی اور بڑھ گئی ہے۔ انسان کی بربریت اور درندگی کا جیتا جاگتا منظر میں نے دیکھا ہے وہاں۔

کرپی: (سرد آہ بھر کر) بھگوان بخشے ہمارے گناہ۔

رام دھن: ہوں! کرپی ہم نے اتنے بڑے گناہ کیے ہیں کہ بھگوان بھی بخشنے سے پہلے ہزار بار سوچے گا۔ میں کہتا ہوں آخر کون سا گھر ہے جس کے لوگ قتل نہیں ہوئے یا زندہ نذرِ آتش نہیں کیے گئے؟ یا جن کی بہو بیٹیوں کی عصمت دری نہیں کی گئی؟ باپو ہندستان بھر میں انسانیت کی آواز بن کر چیخ چیخ کر تھک گیا ہے۔

(رام دھن رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتا ہے)

کرپی: اجی تم مغربی پنجاب اور دیگر علاقوں کی بات چھوڑ دو۔ ہمارے لوگوں نے یہاں دلّی میں کیا کچھ نہیں کیا؟ وہی بات واگھہ کے اُس پار انھوں نے کی۔ ہمارے لوگوں نے اِدھر کر دکھلائی ہے۔ جیسے وحشی وہ لوگ نکلے۔ ایسے ہی وحشی ہم لوگ بن گئے۔ کی کس نے کی ہے؟ مگر لُٹے مرے بے قصور لوگ ہی۔ دونوں طرف بیچارے۔

رام دھن: کرپی وقت آئے گا جب ہم لوگ اپنے کرتوتوں پر پچھتائیں گے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ فرنگی نے تو ہمیں لڑانا ہی تھا مگر ہماری عقل کوئی گھاس چرنے تو نہیں چلی گئی تھی کہ ہم لوگ اُن کی تانوں پر ناچنے لگ گئے؟ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ درحقیقت شیطانیت ہمارے اندر پہلے سے ہی موجود تھی۔ فرنگیوں نے تو بارود کو فلیتہ دکھایا تھا ایک دوسرے کو اُکسا کر۔ مذہبی جذبات کو بھڑکا کر۔ ہر طرح کا لالچ دے کر۔

کرپی: چلو اب اُٹھو بھی۔ اندر بیٹھ کر چائے کا پیالہ پیتے ہیں۔ اور میں کہتی ہوں تم ناحق اپنا خون مت جلایا کرو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب وطن کے نوجوان جانیں اور ان کا کام۔

رام دھن: اگر وطن کا یہی حشر ہونا تھا تو ہم لوگ فرنگیوں کی لاٹھیاں اور گولیاں کس لیے کھاتے رہے؟ میں کہتا ہوں ہم اپنی زندگیاں کس لیے داؤں پر لگاتے رہے؟

(اسی لمحے ایک نوجوان رام لعل دوڑتا ہوا اندر آتا ہے۔ اُس کا سانس قدرے پھول رہا ہے)

رام لعل: (ہانپتا ہوا) لالہ جی سنا تم نے کچھ؟

رام دھن: ارے کیا بات ہے رام لعل؟ خیر و عافیت تو ہے؟ کہیں دنگا فساد تو نہیں ہو گیا؟

رام لعل: (پہلے کی مانند ہی ہانپتا ہوا) لوگ بازار میں باتیں کر رہے ہیں کہ باپو کو... !

رام دھن: (چونک کر) کیا ہوا' باپو کو...؟

رام لعل: باپو کو گولی مار دی گئی ہے...

رام دھن: کیا کہا؟ باپو کو...؟ گولی مار دی گئی ہے؟

(رام دھن ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چارپائی پر یوں بیٹھتا ہے جیسے اس کا سر چکرا گیا ہو)

کرپی: یہ کیا کہہ رہا ہے بیٹا؟ یوں نہ کہہ۔ بھگوان کرے۔ یہ سب جھوٹ ہو...

جھوٹ ہو۔

(کرپی روتی ہوئی کمرے کی طرف چل دیتی ہے۔ اسی لمحے کریم بخش اور ایشر سنگھ بھی اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں)

ایشر سنگھ: (گھبرائی ہوئی آواز میں) ارے او رام دھن، کیا ہوا بھئی؟

کریم بخش: ارے رام لعل کیا یہ خبر سچی ہے۔ یا بس افواہ بھر ہے؟

رام لعل: چاچا! سارے بازار میں یہ خبر گشت کر رہی ہے۔ ذرا گھر کے آنگن سے باہر نکل کر تو دیکھیے۔ لوگ کیسے ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں؟ بازار بند ہو گئے ہیں اور پولیس کی گاڑیاں بھی ادھر اُدھر بھاگی جا رہی ہیں۔

(تمام لوگ چارپائی اور اسٹول وغیرہ پر بیٹھے ہیں اور ان کے چہروں پر ایک تناؤ سا دکھائی دیتا ہے)

کریم بخش: یا اللہ اس فقیر نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؛ اس کی نظر میں تو کوئی ہندو تھا نہ مسلمان۔ وہ تو سبھی کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ایشر سنگھ: گھور کلجگ ہے بھائی کریم بخش۔ مہاتما جی تو عمر بھر عدم تشدد کا پرچار کرتے رہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران بھی جب انھوں نے دیکھا کہ تشدد پاؤں پھیلانے لگا ہے تو فوراً ستیہ گرہ واپس لے لیا اور آج آزاد ہندستان میں۔۔۔ ہے واہگورو تو ہی بخشے گا ہمارے گناہ۔

رام دھن: (آنسو پونچھتا ہوا) ٹھیک بات تو یہ ہے بھائی کہ مجھے تو آدمی سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ اب ہم لوگ کیسے سر اونچا کر کے چل سکتے ہیں؟ ہے بھگوان یہ کیا ہو گیا؟ اُف۔ میں تو باپو جی کے آخری دیدار بھی نہ کر سکا بس جانے کے بارے میں سوچتا ہی رہا۔

ایشر سنگھ: (کچھ گھبراہٹ سے) مگر رام لعل یہ کم بخت ہے کون؟ جس نے مہاتما جی کی جان لی ہے؟

رام لعل: چاچا! لوگ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کسی رفیوجی کا کام ہے۔

ایشر سنگھ: (یک دم کانپ کر) رفیوجی؟ ہے واہگورو یہ بات غلط ہو۔ ہم لوگ تو رام دھن جی پہلے ہی لٹ پٹ کر آئے ہیں۔ ہے واہگورو یہ کلنک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر مت لگانا۔ ہم تو وطن کی خاطر بھاری قیمت چکا کر آئے ہیں۔

کریم بخش: یا اللہ کہیں۔۔۔ کہیں۔۔۔؟

(اندرونی خوف سے کانپ اٹھتا ہے)

رام دھن: پچھلی بار جب میں برلا ہاؤس میں پرارتھنا سبھا میں شمولیت کے لیے گیا تھا تو پولیس والے ہر ایک کی تلاشی لے رہے تھے۔

ایشر سنگھ: اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس کو اس بات کا پہلے سے ہی اندیشہ تھا کہ کوئی شخص مہاتما جی کی زندگی ختم کرنے پر آمادہ ہے۔۔۔ ہے نا؟

کریم بخش: اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر کیا اچھا ہوتا کہ ایسے فرشتہ سیرت انسان کو بچا لیا جاتا۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔

ایشر سنگھ: عین ممکن ہے کہ کوئی 'دل جلا' کوئی ہمارا رفیوجی بھائی ہی ہو۔ جس کے گھر کے سبھی لوگ قتل ہو گئے ہوں۔ اور وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہو؟ کیوں لالہ رام دھن؟

رام لعل: (بات کاٹ کر) بات تو یہی ٹھیک لگتی ہے۔ باپو نے کہا تھا نا کہ میں وطن کی تقسیم ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ چاہے میری زندگی ہی کیوں نہ چلی جائے۔

کریم بخش: ہاں۔۔۔ ہاں باپو تو یہ بھی اعلانیہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان اس کی نعش پر بنے گا۔

رام دھن: درست ہے۔ مگر کریم بخش حالات نے ایسا روپ دھارا کہ باپو بیچارا مجبور ہو کر رہ گیا تھا۔ لاچار اور بے یار و مددگار سب کچھ دیکھتا رہا بس دیکھتا رہا۔

رام لعل: میں نے تو کئی لوگوں کو خوش ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے ابھی۔

ایشر سنگھ: (چونک کر) کیا کہا! باپو کی شہادت پر۔۔۔؟

رام دھن: ایسے لوگ انسانیت سے گرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ احسان فراموش۔ ایسے لوگوں پر ہزار بار لعنت ہے۔۔۔ ہزار بار لعنت۔

کریم بخش: (باہر کی طرف جھانک کر) ارے بھئی۔ وہ دیکھو کانشی رام تھانیدار آ رہا ہے۔ اُسے ذرا آواز دو۔ اس سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا ہوا ہے!

ایشر سنگھ: (باہر جا کر) اجی چوہڑہ صاحب ذرا تشریف لانا ادھر بھی۔

(کچھ وقفے کے بعد کانشی رام چوہڑہ تھانیدار، جو ایک بارعب شخصیت کا مالک ہے اندر آتا ہے۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور تھکاوٹ ظاہر ہے۔ عمر ۳۰ برس کے قریب ہے)

کانشی رام: (اندر آکر) ہے ہند سب
بیٹھے ہیں سر جوڑ کر؟

رام دھن: (اسی طرح غمزدہ لہجے میں)
چوپڑہ صاحب۔ کیا یہ سچ ہے۔ جو ہم نے سُنا
ہ باپو کو... !

کانشی رام: بالکل سچ ہے چاچا، کہتے
ہ مہاتما جی گولی لگتے ہی پران چھوڑ گئے۔
(سب کی نگاہیں چوپڑہ صاحب کے
ے پر گڑھی ہوئی ہیں)

رام دھن: اچھا... ! اچھا...
...!

کانشی رام: مہاتما جی اپنے کمرے
کل کر پرارتھنا سبھا میں جا رہے تھے ابھی کچھ
ہی بڑھے تھے کہ ایک نوجوان نے۔ کہتے ہیں کہ
سر جھکایا اور پھر کمبخت نے گولیاں داغ دیں۔

رام دھن: (سرد آہ بھر کر) ہے رام
رام...

کانشی رام: کہتے ہیں کہ باپو کے مُنہ
ں یہی الفاظ نکلے "ہے رام" اور خون سے
پت ہوکر وہ ابدی نیند سو گئے۔

ایشر سنگھ: ہے واہگورو
ی کیسے لوگ ہیں؟ اُف جس مہاتما کو انگریزی
رکار بھی چاہتے ہوئے ختم نہ کرسکی اس کو
ے اپنے ہی لوگوں نے مار ڈالا۔ واہ!

کریم بخش: اس کو بدترین دشمن
ایشر سنگھ۔ اپنا مت کہو۔

رام دھن: ایک درویش۔ خداپرست
وام کی خدمت کے جذبے سے سرشار انسان
ولی مار کر کس جنم میں بھلا ہوگا اُس کا؟

ایشر سنگھ: مگر چوپڑہ جی یہ تو
ئیے کہ قاتل پکڑا گیا ہے کیا؟

کانشی رام: ہاں، قاتل نے کہاں جانا تھا بھئی۔ پولیس کی گرفت سے بچ نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

ایشر سنگھ: اجی چوپڑہ صاحب کوئی رفیوجی تو نہیں؟

کانشی رام: چچا ایشر سنگھ، قاتل تو قاتل ہی ہے۔ وہ کسی مذہب، علاقے یا ذات سے تعلق رکھتا ہو جو لوگ ایک گنہگار کی اس وجہ سے پردہ پوشی کرنے کی حماقت کرتے ہیں کہ وہ ان کا ہم مذہب ہے تو میرے خیال میں وہ بھی اتنے ہی گنہگار ہیں۔ مجرم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہم پولیس والے تو ایسے مجرم کا شمار انسانوں میں بھی نہیں کرتے۔

ایشر سنگھ: بالکل درست فرمایا ہے چوپڑہ صاحب آپ نے۔

کانشی رام: اچھا بزرگوار مجھے اجازت دیجیے۔ کیوں کہ میں نے ابھی واپس ڈیوٹی پر بھی پہنچنا ہے۔ اس لیے گھر پر بتلانے چلا آیا کہیں گھر والے فکرمند نہ ہوں۔ آج تیس جنوری ۱۹۴۸ء کی یہ شام منحوس ترین شام ہے۔

رام دھن: نہیں... تم جاؤ بیٹا اور اپنی ڈیوٹی بجاؤ۔

کانشی رام: (جاتے ہوئے) اس کے ساتھ ہی میں آپ سب سے درخواست کروں گا اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں اور کسی قسم کے بحث و مباحثہ میں نہ پڑیں۔ عوام کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں اس لیے بحث کرنا بھی مناسب نہیں ہے اور اپنے اپنے گھر میں جاکر بھگوان۔ اللہ۔ واہگورو کے روبرو بات تو ایک ہی ہے، پرارتھنا کریں، التجا کریں، دعا کریں کہ بھگوان اس نیک روح کو چین نصیب کرے۔ اور میں آپ کو بتا دوں کہ دہلی بھر میں پولیس کی گشت تیز کر دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے پولیس کا کوئی دستہ ادھر محلوں میں بھی آنکلے اور آپ لوگوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھ کر کوئی بُرا بھلا جملہ مُنہ سے نکال دے اس لیے...

رام دھن: ہاں... ہاں درست ہے بیٹا۔ چلتے ہیں اپنے گھر کو۔

(کانشی رام تھانیدار ایک طرف کو چل دیتا ہے)

رام دھن: (سرد آہ بھر کر) واہ رے باپو... واہ... تمھارے مقدر میں بھی گولی ہی لکھی تھی۔ اور وہ بھی اپنے ہندوستانی بیٹے کی طرف سے۔

ایشر سنگھ: لالہ رام دھن جی، ہم لوگ تو گورو نانک کو بھی سنگسار کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ ہم گنہگار ہیں۔

رام دھن: (اُٹھ کر) مگر ایشر سنگھ جی اس چلن کو اب بدلنا ہوگا۔ چاہے ہمیں اپنے سینے چھلنی کیوں نہ کروانے پڑیں۔ اب ہم نہیں چلنے دیں گے ایسی اندھیر گردی۔ ایسے وطن دشمن اور انسانیت کے دشمنوں کا سر اب کُچلنا ہی ہوگا۔

کریم بخش: بالکل درست کہا ہے تم نے رام دھن جی۔ اگر ہم لوگ آزادی کے لیے پھانسی کا پھندہ چُوم سکتے ہیں اور بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں تو نفرت کے اس اژدہے کو کیوں نہیں کُچل سکتے؟ ہم تمام سب لوگ مل جُل کر؟

رام دھن: تم ٹھیک کہتے ہو اگر ہم یوں ہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو یہ اژدہا ایک نہ ایک دن قوم کی قوم کو ڈس جائے گا۔ اچھا بھائی آج محلّے میں رات کا کھانا نہیں پکے گا۔

ب کو خبر کردو۔ اس عظیم آتما کے لیے بھگوان سے
ار تھنا کرو رات بھر اور دعا مانگو، بھگوان
یں سچائی کے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔

رام لعل: ہاں... ہاں... چلو بھئی
یڈیو بلیٹن بھی سننا ہے۔

رام دھن: (کمرے کی طرف جاتے
ہوئے) واہ رے باپو... آج تم مجھے...
بہت یاد آرہے ہو۔

ایشر سنگھ: (جاتے ہوئے)
باپو تو ہمیں عمر بھر ہی یاد آتے رہیں گے رام دھن اور
ہم ان کو یاد کرکے ہمیشہ شرمندہ بھی ہوتے رہیں
گے۔

(سب اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیتے
ہیں)

اسٹیج کے پیچھے سے رام دھن کے سُر
اُبھرتے ہیں...

رگھوپتی راگھو راجہ رام
پتت پاون سیتا رام
ایشور اللہ تیرے نام
سب کو سمتی دے بھگوان

اور پھر آہستہ آہستہ یہ سُر فضا کا حصّہ بن جاتے
ہیں۔

پردہ

اسعد بدایونی

جدید تر غزل

اردو غزل نے ہر دور میں معنی کے نئے اُفق دریافت کیے، اور فکر کے بیکراں سلسلوں کی نشاندہی کی ہے۔ اور آج بھی اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف غزل ہی ہے۔ اس مقبولیت میں ایک طرف تو مشرقی مزاج کو دخل ہے اور دوسری طرف غزل کے فن کی مسلسل آبیاری کو۔ نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

"اردو میں شاعری کا مزاج بڑی حد تک غزل سے متعین ہوتا رہا ہے۔ جو شاعر غزل کے مزاج یعنی تغزل سے اپنی نظموں میں کام لیتا ہے وہ کامیاب نظم نگار بھی ثابت ہوتا ہے مثلاً اقبال اور فیض۔"

(تخلیقی ادب، جلد ۲، ص ۱۸۷)

ہمارے عہد میں غزل نے جو صورت اختیار کی ہے وہ اسے دیگر اصنافِ شاعری سے ممتاز کرتی ہے معنی کے پُراسرار جہان، جذبوں کی لطیف دنیائیں، اور فکر کے بیکراں سمندر، نئی اُردو غزل کا امتیاز ہیں۔ نئی غزل میں انفرادی جذبے کو اجتماعی مزاج سے ہم آہنگ کرکے پیش کرنے کا رجحان بہت واضح ہے۔ جبکہ جدید غزل (جو نئی غزل کی پیشرو ہے) میں اجتماعی احساسات کے مقابلے میں انفرادی اور انتہائی ذاتی محسوسات کے شعری اظہار کو بنظرِ استحسان دیکھا جاتا تھا۔ جدید غزل کا امتیاز روایت سے بغاوت اور نئی شعری لسانیات کی تشکیل تھا۔ چونکہ جدید غزل ترقی پسندی کا ردِ عمل تھی لہٰذا اس کے علمبرداروں نے زبان کے منطقی تسلسل، نقطۂ نظر اور مقصد سے گریز کو جزوِ ایمان قرار دیا اور غزل کے ذخیرۂ الفاظ میں حیرت انگیز تبدیلیاں کرنے کی شعوری کوشش کی جس کے نتیجے میں غزل "ہزل" یا مزاحیہ شاعری کے قریب آگئی اور اس پر ہر طرف سے طعن و تعریض کی بارش ہونے لگی۔

یہ سلسلہ اردو غزل میں تقریباً دس برس تک بڑے زور و شور سے جاری رہا اور اس لسانی تخریب نے جدید تر یا "نئی غزل" کے لیے فضا ہموار کرنے کا کام کیا۔ مروجہ زبان سے انحراف کی جو فضا ۱۹۶۰ء کے بعد کی غزل میں نظر آتی ہے وہ دراصل نئے پن کی تلاش کا اضطراب ہے:

اب چاہیے بیٹھ کر شرافت
تر مال تو لے اُڑے لفنگے
ـــــ ظفر اقبال

سورج کو چونچ میں لیے مُرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی
ـــــ ندا فاضلی

مندرجہ بالا اشعار جس قسم کی لفظیات کے حامل ہیں وہ اُردو غزل کا تقریباً ایک دہائی تک امتیاز بنے رہے۔ لسانی توڑ پھوڑ کے اس عمل میں بہت سے سنجیدہ شاعر بھی شامل تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک گروہ ایسے شاعروں کا بھی موجود تھا جن پر اس شور و شغب کا اثر نہ ہوا اور انھوں نے غزل کے سنجیدہ پہلوؤں کو ہی پیشِ نظر رکھا۔ آگے چل کر جس قسم کی غزل کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ انھیں شعرا کی روایت کی توسیع کرتی نظر آتی ہے:

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
ـــــ ناصر کاظمی

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے
ـــــ شکیب جلالی

شب گزشتہ بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی، پہ کہاں تک تجھے صدا دیتے
ـــــ خلیل الرحمٰن اعظمی

اب جہاں پاؤں پڑے گا یہی دلدل ہوگی
جستجو خشک زمینوں کی نہ کر پانی میں
ـــــ مخمور سعیدی

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے
ـــــ شہریار

بجھا جو چاند تو کنجِ چمن میں اک سایہ
لپٹ گیا مرے سینے سے پھر جدا نہ ہوا
ـــــ توصیف تبسم

ٹھہری ہے تو اک چہرے پہ ٹھہری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے
ـــــ وحید اختر

اپنی ناکردہ گناہی نے وہ شہرت بخشی
ہم نمائش میں لگایا ہوا بازار لگے
ـــــ مظہر امام

۷۰ء کے بعد جو نسل شعری منظر نامے پر اُبھری۔ اس کے سامنے اپنے پیشروؤں کی اچھی اور بُری دونوں طرح کی تخلیقات

شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تھیں۔ یعنی ادب اور زندگی کے مثبت و منفی
رجحانات سے اس نسل کو واقفیت حاصل کرنے میں کسی خاص زحمت کا سامنا نہیں ہوا۔ اقلیم غزل میں ساتویں دہائی تک دونوں رویّے موجود تھے مگر اس نسل میں ایسے ذہنوں کی تعداد زیادہ تھی جو سنجیدہ رویے کو پسند کرتے تھے۔ ان نئے فنکاروں نے غزل کا رشتہ روایت سے برقرار رکھنے پر زور دیا اور اس بات کو محسوس کیا کہ غزل کے لیے نئی لسانیات کی کوئی ضرورت نہیں۔ مروجہ زبان ہی ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔

نئی یا جدید تر غزل نے اپنے اصول، ماضی کی کوتاہیوں کی روشنی میں وضع کیے ہیں نئی نسل کے فنکاروں نے روایت کے تمام منابع سے استفادہ کیا ہے اور نئے احساسات، نئے معاشرے اور نئے آدمی کی ضروریات اور جمالیات کے بنیادی تقاضوں کے مطابق اپنی غزل کی زبان وضع کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نئی غزل میں روایتی تغزل سے انحراف تو نظر آتا ہے مگر اُسے یکسر مسترد کر دینے کا رجحان نہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

یہ عشق ہے کہ ہوس، ان دنوں تو پروانے
دیے کی لو کو بڑھا کر دیے پہ گرتے ہیں
_____ صابر ظفر

تجھ سے ملے تو ہم نے یہ جانا کہ آج کل
آہو، شکاریوں کو گرفتار کرتے ہیں
_____ عرفان صدیقی

یہ بھی رہا ہے کوچۂ جاناں میں اپنا رنگ
آہٹ ہوئی تو چاند دریچے میں آگیا
_____ اظہر عنایتی

کچھ بھی نہیں بدلا ہے یہاں کچھ نہیں بدلا
آنکھیں بھی وہی خوابِ پریشاں بھی وہی ہے
_____ شہپر رسول

چاند بھی خاموش ہے دریا بھی حیرانی میں ہے
عکس کس کا ہے کہ اتنی روشنی پانی میں ہے
_____ فرحت احساس

کہاں وہ پیرہن سُرخ اور کہاں وہ بدن
کہ عکسِ ماہ سے بیدار اک سمندر ہے
_____ ثروت حسین

پیش کیے گئے اشعار اس معروضے کی تائید کے لیے کافی ہیں کہ جدید تر غزل کا رشتہ صحت مند تبدیلیوں کے ساتھ ماضی کے مثبت عناصر سے قائم ہے۔

نئی غزل نے عصری زندگی کے تمام اہم رجحانات اور رویوں کو گرفت میں لیا ہے۔ فرد اور معاشرے کے رشتے، ذات اور کائنات کے مسائل، نشاط والم کے جذبے غرض کہ ہر پہلو کا احاطہ نئی نسل کی نئی غزل میں موجود ہے جبکہ چھٹی دہائی کی غزل چند مخصوص موضوعات کے گرد طواف کرتی نظر آتی ہے۔ بے چہرگی کا المیہ، تنہائی، کربِ ذات وغیرہ موضوعات پُرانے رسالوں اور ان شعرا کے مجموعوں میں بکثرت اور بہ آسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ نئی یا جدید تر غزل میں یہ موضوعات آئے تو ہیں مگر اس شدت کے ساتھ نہیں جو پیش رو شعرا کے کلام کا امتیاز ہے۔ جدید تر غزل صرف منظروں کے ملال کی تصویر کشی سے عبارت نہیں بلکہ پُر اُمید اور حوصلہ افزا لمحات و حالات کی جویا بھی ہے۔ اپنی تعمیر کی کوشش فرد میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور یہی خود اعتمادی ذہنِ جدید کی فطرتِ ثانیہ ہے۔

ایک لڑکا شہر کی رونق میں سب کچھ بھول جائے
ایک بڑھیا روز چوکھٹ پر دیا روشن کرے
_____ عرفان صدیقی

خیال آتا ہے رہ رہ کے لوٹ جانے کا
سفر سے پہلے ہمیں اپنے گھر جلانے تھے
_____ آشفتہ چنگیزی

پانی سے اُلجھتے ہوئے انسان کا یہ شور
اُس پار بھی ہوگا مگر اس پار بہت ہے
_____ فرحت احساس

یاد رکھنا ہی محبت میں نہیں ہے سب کچھ
بھول جانا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے
_____ جمال احسانی

یہ لوگ عشق میں سچے نہیں ہیں ورنہ ہجر
نہ ابتدا نہ کہیں انتہا میں آتا ہے
_____ سلیم کوثر

وہیں پہ ہم نے بھی ڈیرے لگا لیے اپنے
ترے خیال کا آنگن بہت کشادہ تھا
_____ شہاب الدین ثاقب

بس در و دیوار مل جاتے ہیں گھر ملتا نہیں
ایسا دستاروں کا جمگھٹ ہے کہ سر ملتا نہیں
_____ نسیم صدیقی

پھڑ پھڑاتی ہوئی لو سایۂ آلام میں ہے
یہ دیا ہے کہ پرندہ قفسِ شام میں ہے
_____ یوسف حسن

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ جدید تر غزل حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کی شیدا نہیں اور نہ ہی اس میں خود کلامی کا وہ انداز پایا جاتا ہے جو اسے دوسروں کے لیے ناقابلِ فہم بنا دے۔ جدید تر غزل اپنے آپ سے باہر دیکھنے کی مسلسل کوشش میں نظر آتی ہے۔ یہ ثقافتی سیاسیات کی طرف پُشت کرکے نہیں کھڑی ہے۔ اس میں اپنی ذات کی شناخت دوسرے کے حوالے سے کرنے کا رجحان نمایاں ہے عزم و حوصلے کا احساس بھی ہویدا ہو چلا ہے۔ اسی لیے نئی

(بقیہ صفحہ ۵۴ پر)

ترجمہ: یونس اگاسکر

دو مراٹھی نظمیں

گڑھی

ایک گڑھی ہے
گڑھی کے اوپر الو بیٹھا ہے
پر وہ تو محض بجوکا ہے

ایشور کی کرپا سے
گڑھی کو مسمار ہونے کے لیے
سترہ سو ساٹھ پشتوں کا گزرنا ضروری ہے

بستی میں گڑھی ہو تو لوگوں کو لگتا ہے
کسی کی پناہ کے سایے میں
زندگی بیت رہی ہے

گڑھی کو بنیاد سے کھودو گے
چوری چھپے
تو اچانک تم پر ڈھے پڑے گی

اور تم بھی ختم ہو جاؤ گے ملبے میں دب کر

گڑھی کو ایک ہی مرتبہ میں
اڑا دینا ہو تو
صبر سے کام لو
موقع دیکھ کر وار کرو

کچھ بھی ہو گڑھی کا مٹنا ضروری ہے
لوگوں کو بتاؤ
گڑھی کے مٹانے کی ضرورت اور اہمیت

گڑھی کی نیو میں
انمول خزینہ پوشیدہ ہے
کیوں نہ اڑا دی جائے یہ بات
آخر ہمیں گڑھی ڈھانے سے مطلب

نارائن کوٹھیکر

تعریف اس خدا کی ...

اس وقت تمھارے سر پر سے جو سایہ گزرا
اس کی بات کر رہے ہو؟
ہو سکتا ہے پرمیشور کا ہو
یا بمباری کرنے والے کسی ہوائی جہاز کا

خواہ مخواہ لڑکھڑاتے کیوں ہو
جیسے پیروں پر نزلہ گرا ہو

اس کڑی دھوپ میں
سر پر کسی سایے کا یہ اٹوٹ گمان لے کر ہی
تمھیں پہاڑ کے اس پار اترنا ہے

گرونانتھ سامنت

شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی

محمد منظور کمال

تذکرہ چائے کا

"کم خرچ بالانشیں" اصول کے تحت چائے کی پیدائش عمل میں آئی ہے۔ اس سے زیادہ سستا نسخۂ تواضع دورِ جدید میں اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ اگر کوئی ملنے والا خواہ عمومی ہو خواہ خصوصی، بن بلائے آئے یا بلائے آئے، بے سبب آئے یا با سبب آئے، بے وقت آئے یا بروقت آئے، آپ اسے گرما گرم چائے پلا کر ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ کر سکتے ہیں۔

چائے تہذیب کی علامت اور اس کی ضمانت بھی ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ چائے کا رسیا ہو گا وہ اتنا ہی مہذب کہلائے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جو حضرات خود کو زیادہ مہذب ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ صبوحی کی جگہ بیڈ ٹی (BED-TEA) لیتے ہیں۔

آپ جدھر بھی چلے جائیے آپ کو چائے کی حکمرانی نظر آئے گی۔ امیر ہو یا غریب، چھوٹا ہو یا بڑا، یہ ہر جگہ قبول عام کی سند رکھتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے پینے میں کسی طرح کی قباحت نہیں ہے۔ وہ عمر رسیدہ اشخاص بھی جو اپنے دانتوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں، پوپلے منہ سے اطمینان سے چسکی لیتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ چائے یوں تو سبھی حلقوں میں پسند کی جاتی ہے مگر ادیبوں کے حلقے میں خصوصیت کے ساتھ مقبول ہے۔ آپ کسی بھی ٹی ہاؤس میں چلے جائیے مختلف میزوں کے گرد حلقہ بنائے ادبا اپنے اپنے خیالات کے ساتھ شغل چائے نوشی کے دوران گرما گرم بحثوں میں مشغول نظر آئیں گے۔ اسی ٹی ہاؤس میں ایک طرف وہ خود ساختہ لیڈر بھی جوش و خروش کے ساتھ تقریر نما بحث کرتے دکھائی دیں گے جن کی دال باہر نہیں گلتی۔ یہ لیڈر جہاں ملکی اور سماجی انقلاب کی بات کرتے نظر آئیں گے۔ وہیں ہمارے ادبا سماجی انقلاب کے ساتھ ساتھ ثقافتی انقلاب کی بات کرتے دکھائی دیں گے اور پورا ٹی ہاؤس انقلاب انقلاب کی آوازوں سے گونجتا نظر آئے گا۔ اگر آپ باریکی سے جائزہ لیں گے تو اس کے پیچھے اسی مشروب کا ہاتھ نظر آئے گا جسے لوگ چائے کہتے ہیں۔

چائے پینا جتنا خوش گوار عمل ہے پلانا اتنا ہی ناخوش گوار فعل، مگر فعل عبث نہیں۔ اجنبی جگہ پر کسی بھی شخص کو علیک سلیک کے بعد اپنا گرویدہ بنانے کے لیے یہ ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ اس کا وار کبھی خالی جا ہی نہیں سکتا۔ اور وہ شخص چائے گزیدہ (سگ گزیدہ کی طرح) ہو کر آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔

چائے رشوت دینے اور لینے میں بھی ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ جس طرح نماز کے لیے وضو لازمی ہے اسی طرح رشوت دینے اور لینے کے لیے کم از کم ایک عدد چائے کا دور ضروری ہے مثلاً کسی آفس میں آپ کو کوئی کام کروانا ہے۔ آپ اس آفس کے مطلوبہ شخص سے شائستہ انداز میں یوں مخاطب ہوں گے۔" جناب کو اگر زحمت نہ ہو تو میرے ساتھ چائے میں شریک ہوں پھر باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی"۔ اب آپ جس قدر "اچھی چائے" پلائیں گے معاملات اتنے ہی اچھے طریقے سے طے پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہر آفس کے سامنے چند دکانیں چائے کی ضرور پائیں گے۔ یہ نسخۂ کیمیا تو چھوٹے مسائل کو حل کرنے کے لیے ہے۔ بڑا یا پیچیدہ مسئلہ ہر بڑا آدمی ٹی پارٹی کے ذریعے حل کرتا ہے۔ مطلوبہ آفیسر یا مطلوبہ لیڈر کے اعزاز میں آپ ٹی پارٹی کا اہتمام کر کے ہر کام بہ آسانی اور بہ رضا و رغبت کروا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ملکی مسائل بھی اسی کے توسط سے حل کیے جاتے ہیں۔

جس طرح ایک ملک کے اندر نظام حکومت چلانے کے لیے کئی سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور ہر پارٹی اپنی مرضی کے مطابق حکومت چلانا چاہتی ہے۔ اسی طرح چائے کے شائقین اپنی اپنی پسند کے مطابق چائے پینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص سرخ چائے پینا چاہتا ہے۔ کوئی لیمن ٹی سے شغل کرتا نظر آئے گا تو کوئی بسکٹ چائے میں ڈبو ڈبو کر کھاتا ہوا دکھائی دے گا۔ ویسے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں مفت کی چائے ملے تو اپنی پسند کا کوئی سوال ہی نہیں۔ جیسی بھی ملے اسی میں کام و دہن کی سیری ہو جاتی ہے۔ مگر ان مختلف اقسام کی چائے پینے والوں میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف پارٹیوں کی طرح آپس میں دست و گریباں نہیں ہوتے اور نہ ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے حق بہ جانب ہونے کا اعلان کرتے ہیں بلکہ ایک ہی ٹیبل کے گرد بیٹھ کر خوش خلاقی کے ساتھ چائے پی کر خوش مذاقی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ گویا چائے کو جمہوریت کی نشانی اور

اقبال اردو لائبریری، محلہ پوکھریا، پوسٹ وضلع
بیگوسرائے ۸۵۱۱۰۱ (بہار)

اس کے پیکٹ کو ٹریڈ مارک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

چائے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر موسم میں یکساں مقبول ہے۔ خواہ گرمی پڑ رہی ہو یا سردی، لوگ ٹھنڈے مزاج کے ہوں یا گرم مزاج کے، چائے کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی جتنی اہمیت بیرونِ خانہ ہے اتنی ہی اندرونِ خانہ بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی اہمیت بیرون در مثبت انداز میں ہے جبکہ اندرون در منفی انداز میں۔ جن بیگموں کے شوہر نامدار چائے پینے کے از حد شوقین ہوتے ہیں اور دن بھر میں ۲۰۔۲۵ کپ سے کم میں سیری نہیں ہوتی۔ ان کی بیگموں کے لیے یہ رقیب روسیاہ (رنگ کی مناسبت سے بھی) سے کم نہیں ہے۔ پہلے بیگمیں ان کی اس عادت سے جھنجلاتی ہیں، پھر بڑبڑاتی ہیں اور پھر یوں گویا ہوتی ہیں:

دن رات فکر چائے میں یوں رنج اٹھانا کب تلک
میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

جہاں چائے کی اتنی ساری خوبیاں ہیں وہیں چند خرابیاں بھی ہیں۔ ایک خرابی یہ ہے کہ اس کے پینے والے شراب نوشوں کی طرح کشادہ دل نہیں بلکہ تھوڑے سے تنگ دل ہوتے ہیں۔ دراصل چائے صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے اور صنعتی پیداوار کی ہر شے "مالی منفعت کی ترازو میں تولی جاتی ہے خواہ یہ مالی منفعت "حرفت" سے ہی کیوں نہ حاصل کی گئی ہو۔ غالباً اسی لیے صنعت کو صنعت و حرفت بھی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے صنعتی مراکز میں کام کرنے والوں کی ٹیبل پر ایک مقررہ وقت میں ایک ایک پیالی چائے مالک کی طرف سے پہنچادی جاتی ہے تاکہ مشروب سرور افزا کام کی رفتار کو تیز سے تیز تر کردے۔

ان خیالات کی روشنی میں چائے کی اہمیت اور افادیت مسلم ہو جاتی ہے۔ یہ نہ صرف لطف اندوز ہونے کے لیے ایک لطیف شے ہے بلکہ اس کے اثرات بھی خاص خاص حالتوں میں دور رس نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آپ اسی سے کر سکتے ہیں کہ جس ملک میں بغاوت کروانی ہو وہاں چائے کی درآمد بند کرادیجیے۔ لوگ خود ہی بغاوت کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔ جبکہ دودھ کے ساتھ معاملہ برعکس ہے۔ جہاں چائے کا درآمد نہ کرنا بغاوت کا سبب بن سکتا ہے وہاں دودھ کا درآمد کرنا بغاوت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دراصل دودھ اور چائے میں خالقِ حقیقی نے ایک ہی طرح کی خاصیت یا تاثیر رکھی ہے۔ دونوں ہی جسم و دماغ کو گرمی پہنچاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دودھ کی گرمی دوسروں کو نقصان پہنچانے کا کام کرتی ہے جبکہ چائے کی گرمی خود کو۔ چائے کی گرمی کی بدولت آپ اسی طرح سوختہ نظر آئیں گے جس طرح دھوپ میں رکھی ہوئی استعمال شدہ چائے کی پتی جبکہ دودھ کی گرمی حیوانی فطرت کو کچھ اس طرح ابھارے گی کہ آپ دوسروں کو ٹکر مارنے کے لیے پر تولتے دکھائی دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت عوام کو چائے مہیا کرتی ہے جبکہ فوج کو دودھ اور وہ بھی خالص۔ آپ کہیں گے کہ جگہ جگہ ڈیری فارم آخر عوام کی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر کھولے گئے ہیں۔ آپ نے بجا ارشاد فرمایا لیکن ڈیری فارم کی حکمت عملی پر غور نہیں کیا کہ وہ پانچ فیصد کریم کی جگہ پچپن فیصد کریم نکالا ہوا دودھ آپ کو سپلائی کرتا ہے۔ تاکہ آپ گرم ہوں مگر اس حد تک نہیں:

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا

المختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چائے ایک ایسا مشروب ہے جو نہ صرف خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہے بلکہ جس کی کارکردگی بھی رنگا رنگ ہے۔

نئی مطبوعات

عبدالرحیم خانخاناں

مصنف: شیخ سلیم احمد
قیمت: ۸۰ روپے
ملنے کا پتا: خسرو کتاب گھر، ۱۵۰، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

شیخ سلیم احمد صاحب ترقیِ اُردو بیورو ے اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور علم دوست شخص یں۔ اُنھوں نے فارسی، اُردو اور انگریزی کی متعدد کتابوں کے مطالعہ کے بعد کتاب "عبدالرحیم خانخاناں" لکھی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ سوانح کے علاوہ اِس کتاب میں "اس عہد کے فکری دھارے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔" خانخاناں اُس فکری دھارے ی علامت کے طور پر اُبھرتا ہے۔ مُصنّف کو محقق یا مؤرخ ہونے کا دعوا نہیں ہے۔" عداد و شمار، اشخاص و مقامات کے ناموں ور تاریخوں سے طبعاً زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔" اِسی لیے اُنھوں نے بقولِ خود "کتاب و حوالوں سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔"

کچھ شک نہیں کہ شیخ صاحب نے کتاب بہت محنت سے لکھی ہے اور اسے ن کے ایک مدّت کے مطالعے کا حاصل سمجھنا چاہیے۔ اُنھوں نے خانخاناں کے زمانے کے کری دھاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

"مجدد الف ثانی کی آمد کے ساتھ ہندوستان میں بنیاد پرستی اور کٹّر مذہبیت کا دَور شروع ہوتا ہے۔"

اس مقام پر تلسی داس جی کا ذکر بھی کیا جانا چاہیے، جو محض شاعر یا سَنت نہیں تھے، بلکہ جنھوں نے ہندوستان کے فکری دھارے کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ قطع نظر اِس سے کہ انھوں نے راون کے نیست و نابود کر دیے جانے کی داستان سُنائی تھی، ضمناً بعض ایسی باتیں بھی کہہ دی تھیں جن کے نتائج بڑے دور رس اور دیر پا ثابت ہوئے۔ مثلاً انھوں نے ڈھول، سودر، عورت اور چوپایوں کو ایک درجے میں رکھ کر یہ حکم لگایا کہ یہ چاروں پیٹے جانے کے ہی "ادھکاری" ہیں۔ فکر کے دھاروں کا سراغ زبان سے بھی لگایا جاتا ہے مثال کے طور پر ملک محمد جائسی نے دُودھ کے لیے معمولاً لفظ "کھیر" نظم کیا ہے لیکن رام چرت مانس میں ہے:

ہوت پَرات بَٹ چھیر منگاوا

کھیر اور چھیر سے طبایع کے رجحان کا پتا چلتا ہے اور اس پہلو سے بحث بھی ضروری تھی۔

کتاب میں ضمناً شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا بھی ذکر آگیا ہے۔ ان کے نام کے ساتھ "گنگوہی" کے لاحقے سے حافظ محمود خاں شیرانی نے بھی دھوکا کھایا ہے۔ یہ بزرگ ردولی کے رہنے والے تھے۔ رشد نامہ انھوں نے اپنے وطن ہی میں مکمل کر لیا تھا۔

اس کتاب میں تصوّف کے مباحث کا بیان ہوا ہے اور ہر پچی بات کی تائید، توضیح اور تصریح کے لیے چوپائی، دوہرے وغیرہ نقل کیے گئے ہیں۔ اِس کتاب میں شیخ سلیم نے اپنے سنسکرت اشعار بھی لکھے ہیں جن کو عام سنسکرت شعروں سے ممیز کرنے کے لیے انھوں نے "شلوک" کے بجائے "سرلوک" کہا ہے اور یہ اصطلاح پہلے سے مروّج تھی۔ یہ بات کہ ان کی خانقاہ میں ہر صبح "پرانیام" ہوتا تھا کہاں سے لی گئی ہے، مجھے معلوم نہیں۔ یہ بھی ظاہر نہیں کہ اِس مقام پر اِس اصطلاح سے کیا مراد ہے۔ دراصل اِس سلسلے کے شاعروں نے بیشتر الفاظ کو اُن کے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے مثلاً حضرت عثمان کو "بڑا پنڈت" حضرت علی کو زبردست "سنگھ" کہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود قرآن کے لیے لفظ پُران استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اُن کے کلام کا مطالعہ صحیح پس منظر میں کیا جانا ضروری ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان حضرات کی بھگتی سوَر اور تلسی کی بھگتی سے الگ ہے۔ ان کی بھگتی ذاتِ مطلق کے لیے ہے جب کہ مذکورہ دونوں حضرات کی بھگتی متعین اور مخصوص شخصیتوں سے متعلق ہے۔

کتاب کے مباحث یہ ہیں:

"بیرم خاں، ابتدائی زندگی، گجرات کی مہم، سندھ کی معرکہ آرائیاں، خانخاناں دکن میں، جہانگیر اور خانخاناں، شہزادہ خرم اور خانخاناں، سیرت و شخصیت، علم و ادب اور تصوف، تعمیرات، شیخ احمد سرہندی اور خانخاناں، رحیم کی ہندی شاعری۔"

اِن عنوانات سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مُصنّف نے خلاصے کے طور پر کتاب کے آخر میں کہا ہے کہ :

"خانخاناں ایک ممتاز عالم، سخنور، سخن پرور، عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کا ماہر تھا۔ وہ ادب اور فنونِ لطیفہ کا بڑا سرپرست تھا۔ مآثرِ رحیمی میں ایسے شعرا کی طویل فہرست دی گئی ہے جو اُس کے خوانِ کرم سے پرورش پاتے تھے۔ اس کی فیاضی اور سخاوت ضرب المثل ہے۔"

ایسے شخص کا تعارف کرانا وقت کی ضرورت ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ شیخ سلیم احمد صاحب نے اِس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ شیخ سلیم احمد صاحب نے اِسے مفید تر بنانے کے لیے اِس میں خانخاناں، اکبر، جہانگیر وغیرہ کی سولہ تصاویر شامل کی ہیں اور اُن کا تعارف بھی کرایا ہے۔

—— محمد انصار اللہ

۴/۱۱/۲۷، سرسید روڈ، سرسید نگر، علی گڑھ (یو۔پی)

پریم چند کے سَو افسانے

ترتیب : پریم گوپال مِتّل
صفحات : ۹۲۸
قیمت : ۲۸۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اپنے دَور کے دوسرے حسّاس لوگوں کی طرح پریم چند اصلاح پسند نظریوں کے قائل تھے۔ انھوں نے اس بات کا احساس دلایا کہ افسانہ لوگوں کے دِلوں کو متأثر کرنے اور ان کے خیالات کی تعمیر و تہذیب میں نہایت اہم کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کو خیال کی دُنیا سے نکال کر مادّی دُنیا کو سمجھنے کا وسیلہ بنایا اور تخیلاتی اور تصوّراتی موضوعات کو اپنانے کے بجائے فکری موضوعات کو اپنایا۔ عام طور پر انھوں نے اپنے وقت کے سماجی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ تعلیم کی کمی، بُرے رسم و رواج، عورتوں کے ساتھ بُرا سلوک، سماج کے نچلے طبقے کے لوگوں پر اُونچے طبقے کے لوگوں کا ظلم اور دوسرے مسائل کو بیان کرکے پریم چند نے اس بات کا احساس دلایا کہ جب تک ہندوستانی سماج سے ان بُرائیوں کو ختم نہیں کیا جائے گا ہندوستانی عوام غربت اور جہالت کے شکنجوں میں جکڑے رہیں گے۔ پریم چند کی ہمدردی ہمیشہ کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ رہی۔ ان کا مشاہدہ ایک تماشائی کا مشاہدہ نہیں، سماج کے کمزور اور مظلوم طبقے کے ایک نمائندہ کا مشاہدہ ہے۔ ان کے محسوسات اس زمین سے وابستہ تھے جس پر وہ پیدا ہوئے تھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعی تأثر ایسا ہے کہ ان کی سادگی ہی ان کا حسن بن جاتی ہے۔ ان کے فن کا کمال کرداروں کی فطری پیش کش میں مضمر ہے۔ جس انداز بیان کو انھوں نے اپنایا، اُردو افسانہ نگاری کے اُس ابتدائی دَور میں اس کا خاص مقام اور اس کی خاص اہمیت ہے۔

پریم چند کے افسانے ایک لمبے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ان کے فن نے ترقّی کے مختلف مدارج طے کیے ہیں۔ انھی مدارج کے پیشِ نظر پریم گوپال مِتّل نے پریم چند کے ایک سو منتخب افسانوں کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ یہ بڑا جوکھم، اور محنت کا کام تھا جسے پریم گوپال مِتّل نے تن تنہا انجام دیا ہے۔

پریم چند کے بعض افسانوی مجموعے اب نایاب ہیں۔ ان کی تلاش میں انھیں کتنی ہی لائبریریوں کی خاک چھاننی پڑی ہوگی۔ پھر پہلی بار افسانہ کب شائع ہوا اس کی تحقیق کرنی پڑی ہوگی۔ پریم گوپال مِتّل کے ترتیب و انتخاب کردہ اس مجموعے سے اس تاریخی غلطی کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" ہے۔ ابھی تک افسانے کی تاریخ میں یہ غلط روایت چلی آرہی تھی۔ اس سلسلے میں خود پریم چند کے بیان کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ لیکن پریم گوپال مِتّل نے پریم چند کا پہلا مطبوعہ افسانہ "صلۂ ماتم" کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے :

"پہلی بار : کہانیوں کے مختصر مجموعے 'سوزِ وطن' میں جون/جولائی ۱۹۰۸ء میں شائع۔" (ص ۲۳)

پریم گوپال مِتّل نے اسی طرح ہر افسانے کی کسی رسالے میں اشاعت یا مجموعے میں شمولیت کی نشاندہی کی ہے اور سالِ اشاعت بھی دیا ہے۔ فہرست میں بھی انھوں نے "نام کتاب" اور "پہلی بار شائع" کی سُرخی کے تحت تفصیل دی ہے۔

مجموعہ "پریم چند کے سَو افسانے" میں شامل ترتیب وار افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں لکھے گئے پریم چند کے افسانوں میں فن کے لحاظ سے وہ صفائی، ویسا سلیقہ اور ویسی ہم آہنگی نہیں جو بعد کے افسانوں میں ہے۔ ابتدا میں لکھے ہوتے

افسانے زیادہ تر لمبے اور بیانیہ ہیں۔ بعد کے افسانے ساخت کے لحاظ سے زیادہ مکمل، مختصر اور ڈرامائی انداز لیے ہوتے ہیں۔ یہ افسانے ایک پُر اثر مصوّری کا مظاہرہ کرتے ہوتے اختتام کو پہنچتے ہیں ——— فن اور اثر انگیزی کے لحاظ سے ابتدائی افسانے جذباتی اور نظریاتی ہیں۔ وہ ہر حال میں کسی اعلیٰ اصول کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کا اثر اصلاحی ہوتا ہے۔ آگے چل کر حالات کی مصوری اور انفرادی جذبات کے اظہار میں زیادہ چابکدستی آگئی ہے۔ انسانی فطرت پر یقین کامل کی وجہ سے پریم چند کی اصول پرستی کا رجحان یا میلان یہاں بھی دکھائی دیتا ہے لیکن بعد میں یہ میلان نظریاتی سے زیادہ اصولی ہے۔ انھوں نے ادب کی ابدی قدروں پر توجّہ دینے کے بجائے فن کو اپنے وقت کی سیاسی، سماجی اور اصلاحی تحریکوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کے افسانوں میں عشق کا جو تصوّر ملتا ہے، خلوص، وفا اور ایثار اس کی خصوصیت ہے۔ پریم چند کے افسانے ان کے دور کی کشمکش، آویزش اور سراسیمگی کی عکاسی کرتے ہیں جن سے عوام، تاریخ کے اس نازک دور میں گزر رہے تھے۔

پریم گوپال متّل نے اپنے پندرہ صفحے کے "مقدمہ" میں پریم چند کے افسانوں کی مختلف خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور ادب کے تناظر میں بعض متعصبانہ روایتوں کو حوالے سے رد بھی کیا ہے۔

اس مجموعے میں پریم چند کی اُردو تحریر کا عکس اور بعض نایاب تصویریں بھی شامل ہیں۔

——— مناظر عاشق ہرگانوی

مارواڑی کالج، بھاگلپور (بہار)

الواح الصنادید

تالیف: مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی

صفحات: ۴۰۰

قیمت: ۱۰۰ روپے

ناشر: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، میردرد روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے دَور میں ہندوستان کو علم و حکمت کی دولت سے مالا مال کیا تھا، اور امت اسلامیہ کی کامیابی و کامرانی کے لیے ایک شاہراہ قائم فرماگئے تھے برِ صغیر میں آج جس قدر علماء و مشائخ اور مدارس دینیہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات ہیں، وہ سب دراصل اسی شاہراہ پر گامزن اور اسی خاندان ولی اللہی کے خوشہ چیں ہیں۔

عرصے سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ ان کے علم و فن کی اشاعت کی غرض سے ان کے نام پر ایک اکادمی قائم کرتا، اور حضرت شاہ صاحب اور آپ کے اہلِ خاندان کی علمی و دینی خدمات سے آج کے لوگوں کو روشناس کراتا تاکہ اس روشنی سے آج کی مادی فضا منور ہوتی، اور اس ناسازگار دَور کے باشندوں کے لیے روحانی تسکین کا سامان فراہم ہوتا۔

لائقِ مبارکباد ہیں جامعہ رحیمیہ دہلی کے استاد محترم مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی جنھوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا، اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان اور عقیدت مندوں کے حالات پر قلم اٹھایا، اور محنت و جانفشانی سے ایک کتاب مرتب کر دی، اور جس کی اشاعت کے لیے جامعہ رحیمیہ دہلی کے متولی ہی تھے، انھوں نے شاہ ولی اللہ اکیڈمی دہلی کی داغ بیل ڈال دی، جو آئندہ بھی اسی نہج پر کام کرتی رہے گی۔

زیرِ نظر کتاب میں شاہ ولی اللہ اور آپ کے صاحبزادگان حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ کے حالاتِ زندگی مکمل طور پر آگئے ہیں، بالخصوص شاہ ولی اللہ کی علمی، دینی اور معاشی خدمات پر سیر حاصل بحث آگئی ہے۔ مصنّف نے کتاب میں بڑے خلوص کے ساتھ ان بزرگوں کے حالات کو قلم بند کیا ہے جو پڑھ کر قلب گرمی محسوس کرتا ہے اور سکون و اطمینان کی دولت سے معمور ہوتا ہے۔

اس خاندان کے علاوہ بیسیوں اُن علمائے حق کا تذکرہ بھی اس کتاب میں آگیا ہے جن کے نام تو عوام و خواص سنتے تھے مگر ان کی خدمات کی تفصیل سے بے خبر تھے، اسی طرح کچھ ایسے شعرا کرام اور سیاسی زعمائے ملّت کے حالات بھی جمع کیے گئے ہیں، جو اس لائق تھے کہ خواص و عوام کو ان کے حالات سے واقف کرایا جائے جیسے مولانا مملوک العلی، مومن خاں مومن، مولانا عبید العلی قاسمی، مولانا محمد حسین، سمیع اللہ خاں، مولانا امین الدین بانی مدرسہ امینیہ دہلی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور دوسرے حضرات اہلِ علم و فن۔

زبان و بیان سلیس و صاف اور رواں دواں ہے۔ کتاب ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔

شروع کتاب میں خواجہ احمد فاروقی

کے قلم سے پیش لفظ ہے اور محترم مولانا محمد ولی رحمانی کے قلم سے ایک بیش قیمت مقدمہ بہ خود ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے، ابتدا میں جامعہ رحیمیہ دہلی کا مختصر تذکرہ بھی تمہید کے طور پر آگیا ہے۔

مفتی ظفیر الدین مفتاحی

مفتی دارالعلوم، دیوبند (یو.پی)

ہو بہ ہو

مُصنّف : پروانہ ردولوی

صفحات : ۱۴۲

قیمت : ۵۰ روپے

ملنے کا پتا: حیا پبلشنگ ہاؤس، ۸، اشوک گنڈ، وشوا کرما نگر شاہدرہ، دہلی ۱۱۰۰۹۵

یہ کتاب اُردو کے کہنہ مشق صحافی جناب پروانہ ردولوی کے چند خاکہ نما مضامین کا مجموعہ ہے۔ انھیں خاکہ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ خاکے میں کسی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جس جزرسی کے ساتھ مطالعہ پیش کیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک مکمل کردار سامنے آتا ہے، اُس سے یہ خالی ہیں اور محض تعارفی مضامین کہنا اس لیے مناسب نہیں کہ ان کی بنیاد معروضیت پر نہیں، تاثرات پر رکھی گئی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر مضمون کا آغاز حلیہ نگاری سے ہوا ہے جو خاکے کا خاصّہ ہے۔

مُصنّف نے "عرضِ واقعی" میں لکھا ہے:

"ان (مضامین) کو احاطۂ تحریر میں لانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے عہد کے چند جانے پہچانے افراد کو جن سے میرے قریبی تعلقات ہیں، میں نے جس نظر سے دیکھا ہے اور ان کی وہ تصویر جو میرے تجربات اور محسوسات کے آئینوں میں اتری ہے من و عن پیش کردوں۔"

ان لفظوں میں فاضل مصنّف نے اپنے مطالعے کی حدیں واضح کردی ہیں۔ یہ حدبندی دو نتیجوں تک لے جاتی ہے: انھوں نے شخصیتوں کے صرف وہی پہلو دکھائے ہیں جن کا عکس اپنے "تجربات و محسوسات" کے آئینے میں خود انھوں نے دیکھا ہے، یعنی کسی شخصیت کی مکمل تصویر پیش کرنے کے وہ دعویدار نہیں۔ دوسرے جہاں تک نجی "تجربات و محسوسات" کا تعلق ہے، ان کا آئینہ ذاتی تعصبات کی گرد سے دھندلا بھی سکتا ہے۔ اس امکان کی طرف کتاب کے ایک دیباچہ نگار مخمور سعیدی نے بھی قارئین کو متوجہ کیا ہے۔

فاضل مُصنّف کا یہ بیان دُرست ہے کہ جن لوگوں پر انھوں نے قلم اُٹھایا ہے وہ "اپنے عہد کے جانے پہچانے افراد" ہیں لیکن موصوف نے ان "جانے پہچانے افراد" کے بارے میں جو بعض باتیں کہی ہیں وہ اُن معلومات کی روشنی میں، جو دوسرے معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے، خاصی مشکوک ٹھہرتی ہیں۔ مثلاً سیّد شریف الحسن نقوی پر مضمون میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے بارے میں حالانکہ انھوں نے نام نہیں لیا ہے، ان کے بیان کردہ تاثرات، جن میں کوئی ایسا شخص شریک نہیں ہوسکتا جو بیدی صاحب سے واقف ہے۔ یا گوپال متل کے خاکے کے آخر میں انھوں نے جو باتیں میرے نام سے منسوب کردی ہیں، صحیح نہیں ہیں۔ موصوف نے میری بات چیت کا مفہوم اپنے طور پر طے کرلیا ہے۔

جن شخصیتوں پر یہ مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں دو چار حضرات (جیسے احمد جمال پاشا، سیّد شریف الحسن نقوی، مجتبیٰ حسین) کو چھوڑ کر سبھی شاعر ہیں۔ جناب پروانہ نے ان کی شخصیت پر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری پر بھی اپنی رائے ظاہر کی ہے مگر محض ایک دو جملوں میں؛ مثلاً: "محسن زیدی کے کلام میں ہم نے جب بھی کرب، اضطراب اور بے چینی تلاش کی ہے، مُنہ کی کھانی پڑی ہے۔ اس کی وجہ شاید ان کی کرب سے خالی زندگی ہے۔" یا "کمار پاشی غزلیں بھی کہتے ہیں مگر بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں جو اساطیری اشارے ملتے ہیں وہ کہیں اور نظر نہیں آتے اور اگر نظر بھی آتے ہیں تو بہت کم۔" یہ آرا شاید زیادہ وقیع ٹھہرتیں اگر ان میں استدلال کا عنصر بھی شامل ہوجاتا اور "مُنہ کی کھانی پڑی" جیسے محاوروں کے استعمال سے گریز کیا جاتا۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جن شخصیتوں پر مضامین اس میں شامل کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کا تعلق دہلی سے ہے؛ اس لیے ان کے ذکر کے ساتھ اس ادبی ماحول کا ذکر بھی آگیا ہے جس کا یہ لوگ حصّہ بھی رہے اور اس کے معمار بھی۔ ذکر سرسری ہے لیکن آزادی کے بعد کی دہلی کی ادبی اور ثقافتی زندگی کی تاریخ اگر کوئی لکھنے بیٹھے گا تو اسے اس کتاب میں کچھ نہ کچھ کام کی باتیں شاید مل جائیں گی۔

کتاب میں پروانہ صاحب کا خاکہ

شامل ہے جو اُن کی رفیقۂ حیات نے لکھا ہے۔ پروانہ صاحب کے برعکس جنھوں نے اکثر منفی اندازِ نظر سے کام لیا ہے اُن کی بیگم صاحبہ کا نقطۂ نظر مثبت ہے اور انھوں نے اپنے شوہر کے خاکے میں صرف ان کی خوبیاں ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

—— پریم گوپال متل

۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عروسِ فکر

مصنف : برج موہن طوفان

صفحات : ۱۶۰

قیمت : ۵۰ روپے

تقسیم کار : (۱) برج موہن طوفان، ۱۲۰، بابر روڈ، نئی دہلی

(۲) نازش بک سینٹر، ۲۲۰۷، پھاٹک تیلیان، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

(۳) نازش بک سینٹر، گھیر میر عالم خاں، اندرون نائب صاحب کی نال، ٹونک

مصنف نے کچھ رومانوی کچھ نیم فلسفیانہ خیالات اُردو نثر کی دو دو تین تین سطروں میں باندازِ اشارات پیش کر کے اپنے شعری ذوق کی تسکین کی ہے۔ موضوعات کی تعداد نو ہے ایک بطور نمونہ حسبِ ذیل ہے:

اصل عنوان فنا اور بقا

وضاحتی الفاظ جسم اور جان

کتاب کی کم و بیش چار سو سطروں میں متفرق اور منتشر خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر بامقصد ہیں۔ کچھ میں آورد ہے اور کچھ بے ضرورت ہیں۔ بحیثیت مجموعی معنویت کا حصہ زیادہ ہے مصنف کا تخلص "طوفان" ہے مگر اس کتاب میں طوفان کی کوئی علامت نہیں عبارت سے کچھ ایسا تاثر ملتا ہے کہ خاموش لہریں تلاشِ ساحل میں سرگرداں ہیں اور ساحل ہے کہ دور تر ہوتا جا رہا ہے مصنف ہر مرحلے پر نامطمئن اور بے یقینی کا شکار ہے کچھ پہلو رجائیت کے بھی ہیں جن سے طوفان صاحب کی حوصلہ مندی کا اظہار ہوتا ہے لیکن ان کی تعداد کم ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ طوفان صاحب نے اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے اُردو کو اپنایا ہے امید کی جاتی ہے کہ موصوف کی اگلی کتاب میں زبان کے معیار کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

کتاب بہت دیدہ زیب ہے۔

—— تاباں نقوی امروہوی

سی ۵۲، منٹو روڈ کمپلیکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

حصارِ فکر

شاعر : گوہر شیخ پوروی

صفحات : ۱۶۰

قیمت : ۲۷ روپے

ملنے کے پتے : (۱) ۲۸/۳۸، تلیا باغ، بنارس ۲۲۱۰۰۲

(۲) سردار بک ڈپو، گلزار باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

(۳) ظفر منزل، محلہ مغل پورہ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۸

"حصارِ فکر" گوہر شیخ پوروی کی ادبی خدمتوں کا (بشکل کتاب) پہلا نمونہ ہے۔

"حصارِ فکر" کی غزلوں میں عشق و محبت کے گیت بھی ہیں مگر عصری حسیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ چند شعر اپنی بات کے ثبوت میں درج ہیں:

دفتر سے تھک کے آئے سرِ شام سو گئے
اکثر ہماری رات بھی ہم سے خفا ہوئی

لگ گئی آخر مری تہذیب کو کالی نظر
اب تو سنتے ہی نہیں بچے بڑوں کی بات بھی

وہ گھر کے در و بست سے واقف بھی ہو کیسے
جو شخص کرائے کے مکانوں میں رہا ہے

گوہر شیخ پوروی کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ "گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم" کرنے کا فن جانتے ہیں:

جب کوئی ٹائر رگڑ سے چیختا تو سمجھے یہ لوگ
ہوشیاری سے سڑک کو پار کرنا چاہیے

فٹ پاتھ پہ آرام ملے گا اسے شاید
جو گھر کے در و بام سے اب اوب رہا ہے

شہر کی بھیڑ میں یہ اپنا وجود تنہا
جیسے فٹ بال کسی کھیل کے میدان میں ہے

رہے ہیں گوہر نایاب کی طرح لیکن
ہم اپنے آپ کو شوکیس میں سجا نہ سکے

"حصارِ فکر" کی شاعری زندہ شاعری ہے جو اپنے ساتھ شاعر کو بھی حیاتِ جاوداں بخشے گی۔

"حصارِ فکر" کی غزلوں اور گوہر شیخ پوروی کی شاعری کے باب میں پروفیسر عنوان چشتی

قول میرے محسوسات کی بھی تائید کرتا ہے:
"اس دور میں جب کہ فیشن اور فارمولوں کے تحت شاعری کرنے والوں کا ہجوم ہے اور ان کے مجموعے حشرات الارض کی طرح شائع ہورہے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ ابھی کچھ دیوانے اُردو شاعری کی زندہ روایات کا احترام کررہے ہیں۔ گوہر شیخ پوروی ایسے ہی مخلص شاعر ہیں جو گروہی عصبیت اور بھیڑ چال کی مخالف ہوا کی زد پر تخلیقی تجربوں کا چراغ روشن کررہے ہیں"۔

"حصار فکر" کا ٹائیٹل خوبصورت ہے۔ دوسرے اور تیسرے فلیپ پر پروفیسر عنوان چشتی اور ظہیر غازی پوری کی آرا درج ہیں۔ ٹائیٹل کے چوتھے صفحے پر مصنف کی تصویر اور مختصر سوانح تحریر ہے۔

اس کتاب کی زینت میں ناوک حمزہ پوری، فرحت قادری اور ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین صدر شعبۂ اُردو فارسی سی۔ایم۔ کالج دربھنگہ کے مضامین کا بھی بڑا دخل ہے۔ جس کا مطالعہ گوہر صاحب کے شاعرانہ شعور کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔

کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اُتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

——— دلکش غازی پوری
سی۔کے۔ ۴۸/۴۴، قاضی پورہ کلاں دالمنڈی، بنارس
۲۲۱۰۰۱

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے
موصولہ عنوانات

دسمبر ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں ــــ "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جارہے ہیں۔

شعری عنوانات

حیراں کھڑی ہوئی ہے دوراہے پہ زندگی
ناکام حسرتوں کا جنازہ لیے ہوئے (نامعلوم)
مرسلہ: غوثیہ بیگم غوثی گجراتی،
G.F 337C/II، بٹلہ ہاؤس کالونی،
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

تصویریں بھی ہیں وہی بگڑے ہوئے تیور
آنکھوں میں مروت کا کہیں نام نہیں ہے (نامعلوم)
مرسلہ: صبیحہ خانم، اودگی کلاں

آنکھوں میں مری درد کا بادل نہیں دیکھا
صحرا کو کبھی لوگوں نے جل تھل نہیں دیکھا (منیر سیفی)
مرسلہ: سید عبید اللہ، پٹنہ

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں (شاد)
مرسلہ: احسان اللہ عمیر، دربھنگہ

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی (اقبال)
مرسلہ: عمیر احمد خاں، اودگی کلاں

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی (اقبال)
مرسلہ: مسعود احمد خاں، اودگی کلاں

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی (اقبال)
مرسلہ: آفتاب احمد خاور، جے پور

جہاں سے شکل کو تیری ترس ترس گزرے
جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گزرے (مومن)
مرسلہ: ممتاز علی، بھاگلپور

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے (غالب)
مرسلہ: محمد رشید، گیا

سرد موسم اک ردا اور طفلِ ناداں ساتھ ہے
اے خدا ان بے کسوں کی آج یہ اوقات ہے (نامعلوم)
مرسلہ: صابر علی صابر، سہارن پور

جلوہ بقدرِ ظرفِ نظر دیکھتے رہے
کیا دیکھتے ہم ان کو مگر دیکھتے رہے (نامعلوم)
مرسلہ: اے۔ علی، برہان پور

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں (اصغر گونڈوی)
مرسلہ: معین الدین شمسی، گریڈیہہ

ہر سمت ہواؤں سے اب آگ برستی ہے
بچنے کے لیے کوئی جائے تو کدھر جائے (اظہر نیّر)
مرسلہ: زخشندہ شاذیہ، فرخندہ نازیہ
(بھلائی نگر) شاہین فاروقی (نئی دہلی)

ذرا آنکھیں کھلی رکھ کر تو دیکھو
بغاوت اب کہاں تک آگئی ہے (صابر فخرالدین)
مرسلہ: محمد سلیم الدین، رائچور

دنیا کا حال زار ذرا آنکھ مل کے دیکھ
تو ذات کے حصار سے باہر نکل کے دیکھ
مرسلہ: مرزا اے۔ بی۔ بیگ، نئی دہلی

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا (افتخار عارف)
مرسلہ: محمد مقصود جالب، سکندرآباد

کاش اک در پہ ٹھہر جاتے ہمارے بچے
ہم نے اس شہر میں بدلا ہے ٹھکانہ برسوں (آفتاب عالم)
مرسلہ: فرحت بی قریشی (پالن پور) عذرا انجم،
حمیدہ بانو، موسیٰ انصاری، عتیق احمد (دیوبند)۔

نثری عنوانات

"ایک چادر میلی سی" (راجندر سنگھ بیدی کا ناول)
مرسلہ: محمد رشید امرت، محلہ بھائی بیگہ،
حیدر نگر، پلاموں ۸۲۲۱۱۵ (بہار)

"میلا آنچل" (رینو کا افسانہ)
مرسلہ: عمیر راجپوری، معرفت محمد نور کریم
راجپور، ڈھولی، چندن پٹی، مظفر پور (بہار)

"آنکھیں" (علیم الحق حقی کا افسانہ)
مرسلہ: غازی اسلام، کٹیہار

"موم کی مریم" (جیلانی بانو کا افسانہ)
مرسلہ: د۔ ع۔ بیابانی، پٹنہ

"سوچ" (فیض احمد فیض کی نظم)
مرسلہ: شمع پروین، گیا

"پردہ" (سید ابوالاعلیٰ مودودی)
مرسلہ: عبداللہ عثمانی، دیوبند

اُردو خبر نامہ



اُردو اکادمی دہلی اپنی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سماجی اہمیت کے کچھ دوسرے کام انجام دینے کی کوششـ بھی کرتی ہے۔ نومبر کی درمیانی تاریخوں میں اکادمی کی طرف سے "نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع پر" لیکچرز کا ایک سلسلہ غالب اکیڈ نئی دہلی میں رکھا گیا۔

تصویر میں دائیں سے: جناب سید کاظم رضا زیدی (چیئرمین بینک ریکروٹمنٹ بورڈ) ہندی کے ادیب اور دانشور جناب کنھیا ا ـن اور اُردو کے اُستاد اور شاعر جناب شہاب جعفری۔

(تصویر: سید فدا ء



اُردو ڈراما فیسٹول

اُردو اکادمی دہلی اُردو میں صنفِ ڈراما کو فروغ دینے کے لیے ہر سال ایک اُردو ڈراما فیسٹول منعقد کرتی ہے اس سال یہ فیسٹول ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ نومبر ۱۹۹۰ء کو شری رام سینٹر، نئی دہلی میں ہوا اور اس میں درج ذیل چھ ڈرامے پیش کیے گئے:

① ۲۵ نومبر کو شاہین پروڈکشنز کی پیش کش "عیدگاہ" ڈراما نگار رنجیت کپور، ہدایت کار مدھو مالتی۔

ڈراما "کیا یہ گستاخی ہے؟" کا ایک منظر۔ اس ڈرامے پر چار انعامات دیے گئے —— ہر ڈرامے میں ہال ناظرین سے بھرا رہا۔

② ۲۶ نومبر کو وِہان کی پیش کش "تمھارے غم میرے" ڈراما نگار ریوتی سرن شرما، ہدایت کار اجے منچندا۔ ③ ۲۷ نومبر کو منچ مادھیم کی پیش کش "کیا یہ گستاخی ہے؟" ڈراما نگار عطیہ بانو، ہدایت کار سیتارام سنگھ۔ ④ ۲۸ نومبر کو وِدوشک کلچرل سوسائٹی کی پیش کش "چیتا کی لکڑی" ڈراما نگار اصغر وجاہت، ہدایت کار پانچانن پاٹھک۔ ⑤ ۲۹ نومبر کو سیون اسٹار کلچرل گروپ کی پیش کش "وفا کی خوشبو" ڈراما نگار ڈاکٹر شبیر صدیقی، ہدایت کار وائی۔پی۔ شرما۔ ⑥ ۳۰ نومبر کو درپن کی پیش کش "دھوئیں کے آنچل عرف چین پور کی داستان" ڈراما نگار ابراہیم یوسف، ہدایت کار رنجیت کپور۔

اکادمی ان ڈراموں کے مصنفوں، ہدایت کاروں اور اداکاروں کو ان کی اچھی کارکردگی پر انعام بھی دیتی ہے۔ اس سال بھی یہ انعامات پیش کیے گئے۔



پچھلے دنوں برِصغیر کے معروف ادیب اور نقاد جناب سیّد وقار رضوی کراچی سے دہلی آئے تو ۳۰ نومبر کی سہ پہر کو ان کے اعزاز میں اُردو اکادمی کے دفتر میں ایک استقبالیہ محفل ترتیب دی گئی —— تصویر میں وقار صاحب پاکستان کی ادبی صورتِ حال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے —— کرسیوں پر، دائیں سے سیّد شریف الحسن نقوی، جناب زبیر رضوی، مخمور سعیدی اور واحد میاں۔

(تصویر: سیّد فدا علی)

"قاضی عبدالغفار: فن اور شخصیت" پر سہ روزہ سمینار

قاضی عبدالغفار ایک بہادر، جری اور دُور اندیش سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو کے ممتاز ادیب اور صحافی بھی تھے مجھے ان سے بہت قریب رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے قاضی صاحب جیسا شریف، مہذب اور ایمان دار آدمی نہیں دیکھا۔ ان کا دل موم کا تھا اور کردار لوہے کا۔ ان خیالات کا اظہار جناب یونس سلیم (گورنر بہار) نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیرِ اہتمام سہ روزہ سمینار" قاضی عبدالغفار فن اور شخصیت" کے افتتاحی اجلاس ۱۶ ر نومبر ۱۹۹۰ء کو اُردو گھر میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ قاضی صاحب نے "جمہور کلکتہ" اور" پیام حیدرآباد" میں جو اداریے لکھے تھے انھیں مرتب کر کے شائع کرنا چاہیے۔ یہ اداریے اس عہد کے سیاست دانوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور یہ شستہ و سلیس زبان کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ اردو کے نقادوں نے قاضی عبدالغفار کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ قاضی صاحب نے اردو فکشن میں غیر معمولی اضافہ کیا تھا۔ انھوں نے ایک صحافی کی حیثیت سے اُردو صحافت کو نیا موڑ دیا تھا لیکن ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا پوری طرح سے اعتراف نہیں کیا گیا۔

تاشقند سے آئے ہوئے ڈاکٹر تش مرزا نے قاضی صاحب مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے قاضی صاحب کو نہیں دیکھا لیکن میں نے ان کی تحریروں سے غیر معمولی استفادہ کیا ہے۔ جب ہم نے اپنا تحقیقی مقالہ" آزادی کے بعد ہندوستان میں اُردو کی نشوونما" لکھا تو انجمن سے شائع ہونے والے" ہماری زبان" میں قاضی عبدالغفار صاحب کے اداریوں اور دوسری تحریروں سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔

انجمن کے صدر سید حامد صاحب نے صدارتی تقریر میں کہا کہ قاضی صاحب نے اپنے کردار اور صحافتی تحریروں سے اپنے عہد کی نئی نسل کو متاثر کیا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے ان کا نام لیے بغیر ادب کی کوئی بات پوری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ہمارے نقادوں نے انھیں نظر انداز کر دیا۔ مجھے دِلی مسرت ہے کہ انجمن اس عظیم فنکار کی ادبی خدمات کا اعتراف کر رہی ہے۔ قاضی صاحب کا انجمن پر حق ہے کیوں کہ سات آٹھ سال تک وہ انجمن کے سیکریٹری رہے تھے مرکزی انجمن کے دفتر کو ۱۹۴۷ء میں نذرِ آتش کر دیا گیا تھا قاضی صاحب نے اس کو دوبارہ زندگی بخشی۔

(شمیم جہاں)

بقیہ:

آٹھواں سفر

سند باد جو سوچوں میں غرق تھا، چونک پڑا —"کس لیے؟"

"—کہ تو کوئی نیا جزیرہ، نئی زمین تلاش کرے۔ جہاں زیتون کے سایوں میں ہماری نسلوں کی جڑیں جمی رہیں؛ پھر کبھی کوئی انھیں اکھاڑ نہ سکے! ...... سندباد۔ تو پھر ایک بار اپنا جہاز نکال، اور اجنبی پانیوں کا رُخ کر... تو دُنیا کا سب سے ماہر جہاز راں ہے۔ ہمیں اپنے جہاز میں لے چل—"

یک بارگی سند باد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "واللہ— اے عزیزو، میں ایسا ہی کروں گا۔ میں تمھارے لیے، تمھارے ساتھ آٹھواں سفر کروں گا۔ میں نے طے کر لیا تھا، اب کوئی سفر نہیں کروں گا۔ مگر اب میں اپنی قسم توڑتا ہوں۔ سفر مقدر ہے تمھارا بھی، میرا بھی... میں سیاہ پانیوں میں جہاز ڈال دوں گا۔ کون جانے کسی جزیرے پر ہمیں راستہ بتانے کے لیے کوئی منتظر کھڑا ہو!"

بقیہ:

جدید تر غزل

غزل کی آواز خاصی بلند ہے۔ لہٰذا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ پیش رو جدید غزل کی داخل بینی سے انحراف کر کے جدید تر یا نئی غزل خارج بینی کے منطقے تک پہنچ گئی ہے۔

آپ کی رائے

○ تاباں نقوی صاحب نے اپنے مضمون
خواجہ خطیر" کے بارے میں میری گزارشات
تمبر ۱۹۹۰ء) کا جواب بہت تفصیل سے لکھا
ہے مگر ان کے بعض جملوں سے میرا تاثر یہ ہے
نہ انھیں میری گزارش سے ناگواری ہوئی ہے۔
لمی مباحث میں طنز اور تلخی آجائے تو بحث و
عقیق کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

تاباں صاحب نے غیر ضروری حوالوں
ا ڈھیر لگا دیا ہے مگر بادب عرض کروں گا کہ وہ
میرے اس ایک جملے کا جواب نہ دے سکے کہ:
میرے علم میں نہیں کہ کسی نے ان کا امروہے
ب انتقال ہونا لکھا ہو۔" اس کا جواب صرف
نا ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ہم عصر یا قریب العہد
اخذ سے صرف ایک جملہ نقل کر دیتے۔

جن کتابوں کے نام تاباں صاحب لکھ
رہے ہیں ان میں کوئی دو سو سال بعد کی ہے کوئی
انچ سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ امروہے کی جن
صنف ورجن تاریخوں سے میری بے خبری کا
تاباں صاحب نے ذکر کیا ہے وہ سب میرے
ذخیرے میں موجود ہیں۔ مگر ان سے تاباں صاحب
کے قول کی تائید نہیں ہوتی۔

صاحب موصوف نے مولوی آل حسن
نخشبی کی "نخبۃ التواریخ" (سال تالیف
۱۲۹۰ھ/۱۸۸۰ء) کا حوالہ دیا ہے جس میں یہ
ہے کہ خواجہ خطیر امروہے میں کب سے تھے۔ اس پر
تنقید کرتے ہوئے آج سے ستر۔ اسّی برس قبل

غلام نبی عباسی نے لکھا تھا:

"تعجب اس امر کا ہے کہ وہ خواجہ خطیر جو چار بادشاہوں کے وزیر رہے انھوں نے امروہے میں سکونت کی، بڑی جمعیت کے ساتھ یہاں آئے اور یہ امر مشہور نہ ہوا۔ اگر تمام امروہے سے پوچھیے تو کوئی یہ بات نہیں جانتا کہ کوئی وزیر بھی امروہے میں آکر رہا ہو۔ حالانکہ اُن سے چھوٹے چھوٹے مرتبے کے لوگ . . . آج تک مشہور چلے جاتے ہیں اور آثار اُن کی امارت کے بہت پائے جاتے ہیں۔ خواجہ خطیر باوصف اس کے کہ وزیر تھے، اُن کی ریاست کے یہاں کچھ بھی آثار نہیں پائے جاتے۔ نہ کوئی قلعہ ان کا تعمیر ساختہ ہے، نہ کوئی جامع مسجد ہے، نہ کوئی محل عالیشان ہے . . . خواجہ خطیر وزیر کو باوصف اس کے کہ وہ کامل بھی تھے۔ کوئی نہیں جانتا نہ کسی مقام پر ان کا مزار ہے۔ وزیر کا مقبرہ تو ایسا ہوتا جسے دیکھنے کو لوگ جایا کرتے تمام امروہے کو ٹٹولیے تو خواجہ خطیر کی قبر کے نام سے ایک اینٹ بھی دیکھنے میں نہ آئے گی۔

(تحقیق الانساب۔ ۲۹۶، ۲۹۷)

تاباں صاحب کی دی ہوئی لمبی چوڑی کتابوں کی فہرست سے صرف خواجہ خطیر کا "وجود" ثابت ہوتا ہے، میں اُن کے خارجی وجود یا عہدے کا منکر نہیں ہوں۔ اختلافی مسئلہ صرف یہ ہے کہ امروہے سے ان کا تعلق ثابت کرنے کے لیے قدیم تر اور مضبوط سند درکار ہے امروہے کے حوالے سے حضرت شاہ شرف الدین سہروردی کا ذکر سفرنامہ ابن بطوطہ میں موجود ہے، سید محمد میر عدل یا شاہ اُبن بدر چشتی کا تذکرہ بدایونی کی "منتخب التواریخ" میں مل جاتا ہے، خواجہ خطیر بھی اپنے عہد کی بہت بڑی شخصیت تھے، مگر امروہے سے ان کے کسی طرح کے تعلق کا کوئی حوالہ کسی قدیم ماخذ میں کیوں نہیں ملتا؟

رہا ان کے نسب کا معاملہ۔ اگر نخشبی حضرات اُن کی اولاد ہیں تو تحقیق الانساب میں ۲۴ محرم ۸۹۴ھ، ۲ شعبان ۹۸۳ھ۔ ۱۴ شوال ۹۹۳ھ۔ ۱۰۰۴ھ۔ ۱۰۵۴ھ شعبان ۱۰۶۶ھ۔ رجب ۱۰۷۲ھ کی متعدد دستاویزوں کے حوالے دیے گئے ہیں جن پر خاندانِ نخشبی کے افراد کے دستخط ثبت ہیں اور کسی نے بھی خود کو علوی یا حسنی یا حسینی یا سید نہیں لکھا ہے جب کہ انھیں دستاویزوں پر دوسرے سید زادوں کے نام کے ساتھ واضح طور پر ایسا لکھا ہوا ملتا ہے۔ جن حضرات کو اس بحث سے علمی دلچسپی ہو وہ تحقیق الانساب مؤلفہ محمود احمد عباسی طبع اوّل ۱۳۵۲ھ/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے صفحات ۲۹۶ تا ۳۰۷ کا بغور مطالعہ فرما لیں۔

عہدِ سلطنت کی کوئی تاریخ منہاج سراج، ضیاالدین برنی اور شمس عفیف وغیرہ سے بے نیاز ہو کر لکھی ہی نہیں جا سکتی، یہ بات دوسری ہے کہ ان کتابوں میں کوئی بات ہمارے معتقدات کے خلاف ہو تو ہم انھیں غیر معتبر کہہ دیں اور ہماری تائید ہو تو ان پر تکیہ کرنے لگیں۔ برنی نے تو خود خواجہ خطیر کی نیکی اور ایمانداری کا ذکر کیا ہے۔

تاباں صاحب کے اور بھی کئی بیانوں

"قاضی عبدالغفار: فن اور شخصیت" پر سہ روزہ سیمینار

قاضی عبدالغفار ایک بہادر، جری اور دُور اندیش سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو کے ممتاز ادیب اور صحافی بھی تھے مجھے ان سے بہت قریب رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے قاضی صاحب جیسا شریف، مہذب اور ایمان دار آدمی نہیں دیکھا۔ ان کا دل موم کا تھا اور کردار لوہے کا۔ ان خیالات کا اظہار جناب یونس سلیم (گورنر بہار) نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیرِ اہتمام سہ روزہ سیمینار "قاضی عبدالغفار فن اور شخصیت" کے افتتاحی اجلاس ۱۶ نومبر ۱۹۹۰ء کو اُردو گھر میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ قاضی صاحب نے "جمہور کلکتہ" اور "پیام حیدرآباد" میں جو اداریے لکھے تھے انھیں مرتب کر کے شائع کرنا چاہیے۔ یہ اداریے اس عہد کے سیاست دانوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور یہ شستہ و سلیس زبان کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ اردو کے نقادوں نے قاضی عبدالغفار کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ قاضی صاحب نے اردو فکشن میں غیر معمولی اضافہ کیا تھا۔ انھوں نے ایک صحافی کی حیثیت سے اُردو صحافت کو نیا موڑ دیا تھا لیکن ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا پوری طرح سے اعتراف نہیں کیا گیا۔

تاشقند سے آئے ہوئے ڈاکٹر تش مرزا نے قاضی صاحب مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے قاضی صاحب کو نہیں دیکھا لیکن میں نے ان کی تحریروں سے غیر معمولی استفادہ کیا ہے۔ جب ہم نے اپنا تحقیقی مقالہ "آزادی کے بعد ہندوستان میں اُردو کی نشوونما" لکھا تو انجمن سے شائع ہونے والے "ہماری زبان" میں قاضی عبدالغفار صاحب کے اداریوں اور دوسری تحریروں سے بہت زیادہ استفادہ کیا

انجمن کے صدر سید حامد صاحب نے صدارتی تقریر میں کہا کہ قاضی صاحب نے اپنے کردار اور صحافتی تحریروں سے اپنے عہد کی نئی نسل کو متاثر کیا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے ان کا نام لیے بغیر ادب کی کوئی بات پوری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ہمارے نقادوں نے انھیں نظرانداز کر دیا۔ مجھے دِلی مسرت ہے کہ انجمن اس عظیم فنکار کی ادبی خدمات کا اعتراف کر رہی ہے۔ قاضی صاحب کا انجمن پر حق ہے کیوں کہ سات آٹھ سال تک وہ انجمن کے سیکریٹری رہے تھے مرکزی انجمن کے دفتر کو ۱۹۴۷ء میں نذرِ آتش کر دیا گیا تھا قاضی صاحب نے اس کو دوبارہ زندگی بخشی۔

(شمیم جہاں)

بقیہ:

آٹھواں سفر

سند باد جو سوچوں میں غرق تھا، چونک پڑا ——— "کس لیے؟"

"——— کہ تو کوئی نیا جزیرہ، نئی زمین تلاش کرے۔ جہاں زیتون کے سایوں میں ہماری نسلوں کی جڑیں جمی رہیں؛ پھر کبھی کوئی انھیں اکھاڑ نہ سکے! ..... سندباد۔ تو پھر ایک بار اپنا جہاز نکال، اور اجنبی پانیوں کا رُخ کر... تو دُنیا کا سب سے ماہر جہاز راں ہے ہمیں اپنے جہاز میں لے چل ———"

یک بارگی سند باد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "واللہ ——— اے عزیزو، میں ایسا ہی کروں گا۔ میں تمھارے لیے، تمھارے ساتھ آٹھواں سفر کروں گا۔ میں نے طے کر لیا تھا، اب کوئی سفر نہیں کروں گا۔ مگر اب میں اپنی قسم توڑتا ہوں۔ سفر مقدر ہے تمھارا بھی، میرا بھی... میں سیاہ پانیوں میں جہاز ڈال دوں گا۔ کون جانے کسی جزیرے پر ہمیں راستہ بتانے کے لیے کوئی منتظر کھڑا ہو!"

بقیہ:

جدید تر غزل

غزل کی آواز خاصی بلند ہے۔ لہٰذا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ پیش رو جدید غزل کی داخلی مینی سے انحراف کر کے جدید تر یا نئی غزل خارج مینی کے منطقے تک پہنچ گئی ہے۔

آپ کی رائے

○ تاباں نقوی صاحب نے اپنے مضمون 'خواجہ خطیر' کے بارے میں میری گزارشات (ستمبر ۱۹۹۰ء) کا جواب بہت تفصیل سے لکھا ہے مگر ان کے بعض جملوں سے میرا تاثر یہ ہے کہ انھیں میری گزارش سے ناگواری ہوئی ہے۔ علمی مباحث میں طنز اور تلخی آجائے تو بحث و تحقیق کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

تاباں صاحب نے غیر ضروری حوالوں کا ڈھیر لگا دیا ہے مگر باادب عرض کروں گا کہ وہ میرے اس ایک جملے کا جواب نہ دے سکے کہ: 'میرے علم میں نہیں کہ کسی نے اُن کا امروہے میں انتقال ہونا لکھا ہو' اس کا جواب صرف یہ تا ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ہم عصر یا قریب العہد ماخذ سے صرف ایک جملہ نقل کر دیتے۔

جن کتابوں کے نام تاباں صاحب لکھ رہے ہیں ان میں کوئی دو سو سال بعد کی ہے کوئی پانچ سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ امروہے کی جن تصنیف و رجن تاریخوں سے میری بے خبری کا تاباں صاحب نے ذکر کیا ہے وہ سب میرے ذخیرے میں موجود ہیں۔ مگر ان سے تاباں صاحب کے قول کی تائید نہیں ہوتی۔

صاحب موصوف نے مولوی آل حسن نخشبی کی "نخبۃ التواریخ" (سالِ تالیف ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کا حوالہ دیا ہے جس میں یہ ہے کہ خواجہ خطیر امروہے میں آ بسے تھے۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے آج سے ستر۔ اسّی برس قبل غلام نبی عباسی نے لکھا تھا:

"تعجب اس امر کا ہے کہ وہ خواجہ خطیر جو چار بادشاہوں کے وزیر رہے انھوں نے امروہے میں سکونت کی، بڑی جمعیت کے ساتھ یہاں آئے اور یہ امر مشہور نہ ہوا۔ اگر تمام امروہے سے پوچھیے تو کوئی یہ بات نہیں جانتا کہ کوئی وزیر بھی امروہے میں آکر رہا ہو۔ حالانکہ اُن سے چھوٹے چھوٹے مرتبے کے لوگ . . . آج تک مشہور چلے جاتے ہیں اور آثار اُن کی امارت کے بہت پائے جاتے ہیں۔ خواجہ خطیر باوصف اس کے کہ وزیر تھے، اُن کی ریاست کے یہاں کچھ بھی آثار نہیں پائے جاتے۔ نہ کوئی قلعہ ان کا تعمیر ساختہ ہے، نہ کوئی جامع مسجد ہے، نہ کوئی محل عالیشان ہے . . . خواجہ خطیر وزیر کو باوصف اس کے کہ وہ کامل بھی تھے۔ کوئی نہیں جانتا نہ کسی مقام پر ان کا مزار ہے۔ وزیر کا مقبرہ تو ایسا ہوتا جسے دیکھنے کو لوگ جایا کرتے تمام امروہے کو ٹٹولیے تو خواجہ خطیر کی قبر کے نام سے ایک اینٹ بھی دیکھنے میں نہ آئے گی۔

(تحقیق الانساب۔ ۲۹۶، ۲۹۷)

تاباں صاحب کی دی ہوئی لمبی چوڑی کتابوں کی فہرست سے صرف خواجہ خطیر کا "وجود" "ثابت ہوتا ہے"، میں اُن کے خارجی وجود یا عہدے کا منکر نہیں ہوں۔ اختلافی مسئلہ صرف یہ ہے کہ امروہے سے ان کا تعلق ثابت کرنے کے لیے قدیم تر اور مضبوط سند درکار ہے امروہے کے حوالے سے حضرت شاہ شرف الدین سہروردی کا ذکر سفرنامہ ابن بطوطہ میں موجود ہے۔ سید محمد میر عدل یا شاہ ابن بدر چشتی کا تذکرہ بدایونی کی "منتخب التواریخ" میں مل جاتا ہے۔ خواجہ خطیر بھی اپنے عہد کی بہت بڑی شخصیت تھے، مگر امروہے سے ان کے کسی طرح کے تعلق کا کوئی حوالہ کسی قدیم ماخذ میں کیوں نہیں ملتا؟

رہا ان کے نسب کا معاملہ۔ اگر نخشبی حضرات اُن کی اولاد ہیں تو تحقیق الانساب میں ۲۴ محرم ۸۹۴ھ، شعبان ۹۸۳ھ۔ ۱۴ شوال ۹۹۳ھ۔ ۱۰۰۴ھ۔ ۱۰۵۴ھ شعبان ۱۰۶۶ھ۔ رجب ۱۰۷۲ھ کی متعدد دستاویزوں کے حوالے دیے گئے ہیں جن پر خاندان نخشبی کے افراد کے دستخط ثبت ہیں اور کسی نے بھی خود کو علوی یا حسنی یا حسینی یا سید نہیں لکھا ہے جب کہ انھیں دستاویزوں پر دوسرے سید زادوں کے نام کے ساتھ واضح طور پر ایسا لکھا ہوا ملتا ہے۔ جن حضرات کو اس بحث سے علمی دلچسپی ہو وہ تحقیق الانساب مؤلفہ محمود احمد عباسی طبع اوّل ۱۳۵۲ھ/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے صفحات ۲۹۶ تا ۳۰۷ کا بغور مطالعہ فرما لیں۔

عہدِ سلطنت کی کوئی تاریخ منہاج سراج، ضیاالدین برنی اور شمس عفیف وغیرہ سے بے نیاز ہو کر لکھی ہی نہیں جا سکتی، یہ بات دوسری ہے کہ ان کتابوں میں کوئی بات ہمارے معتقدات کے خلاف ہو تو ہم انھیں غیر معتبر کہہ دیں اور ہماری تائید ہو تو اُن پر تکیہ کرنے لگیں۔ برنی نے تو خود خواجہ خطیر کی نیکی اور ایمانداری کا ذکر کیا ہے۔

تاباں صاحب کے اور بھی کئی بیانوں

...فتگو ہو سکتی ہے مگر میں اس بحث کو طول دینا ...یں چاہتا اور اب بھی ادب سے گزارش کروں ...ہ کسی ہم عصر یا قریب العہد ماخذ میں امروہے ...ے خواجہ خطیب کے کسی تعلق کا کوئی حوالہ ہو تو ...ش کریں ورنہ یہ تسلیم کریں کہ جو بات میرے ...م میں نہیں اس کا کہیں وجود بھی نہیں۔

_____ نثار احمد فاروقی۔ نئی دہلی

○ نومبر کا "ایوانِ اُردو" قدرے تاخیر سے ...لا۔ حرفِ آغاز کے تحت آپ نے جتنی بھی باتیں ...ھی ہیں ان پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ...یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ ملک کے موجودہ حالات ...کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمارے شاعر و ادیب اب ...ملی طور پر بھی میدان میں آئیں اور متحد ہو کر اس ...ملک کی صدیوں پرانی روایت کو برقرار رکھیں۔ ...و میرے خیال میں حالات کا یہ تقاضا ان شاعروں ...ور ادیبوں کو ضرور گراں گزرے گا جو روپے ...بٹورنے کی خاطر ضمیر فروش بنے بیٹھے ہیں ہمارے ...ادب کے نصف حصّے پر انھیں ضمیر فروشوں کی اجارہ داری ہے۔ ٹٹوؤں کو شبیر بنانے کی کوشش ماحول کو مزید بھیانک بنا دے گی۔ جناب غضنفر کا "حیرت فروش" حیرت انگیز بھی ہے اور اُثر انگیز بھی۔ جناب خوشحال زیدی کا مضمون "بچوں کی لائبریری ____ ضرورت اور مسائل" بڑا اہم ہے۔ موصوف نے بچوں کی تربیت اور نفسیات کے متعلق بہت اچھی باتیں کہی ہیں۔

_____ محمد حامد، دربھنگہ

○ خوبصورت سرورق کے ساتھ نومبر ۹۰ء کا شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ "حرفِ آغاز" کے تحت ایک اچھی دعوت دی گئی ہے۔ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تبلیغ کی ضرورت شاید آج سے زیادہ کبھی نہ رہی ہو گی۔ خلیجی بحران کے تعلق سے جناب قیصر اقبال اور محترمہ قمر جہاں کے افسانے وقت کے مطابق اور لائقِ ستائش ہیں۔ "بازو کی قوت" کے اختتام میں موجودہ عالمی خلفشار اور انتشار کے پیشِ نظر عبداللہ میاں کے ذریعے رحیمو جیسے مایوس اور پریشان ذہن کو ایک بہت ہی صحت مند پیغام دیا گیا ہے

"حالات سے گھبرا کر کب تک اور کہاں تک بھاگتا رہے گا . . . بازو میں قوت پیدا کرے اور اپنی جگہ ڈٹ کر رہنا اور مرنا سیکھ لے . . . آتنک واد، تو ہر جگہ ملے گا۔"

"ایوانِ اُردو" میں ایسی بروقت اور زندہ تخلیق پیش کرنے پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

_____ اظہار رحمانی، کلکتہ

○ "ایوانِ اُردو" نومبر ۹۰ء کا شمارہ دیکھا۔ بہت خوب ہے۔ میں اسے پابندی کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں۔ مگر اس بار پہلی دفعہ "حرفِ آغاز" تا صفحہ آخر پڑھ گیا۔

سلام بن رزاق کی لکھی ____ "راجندر سنگھ بیدی: کچھ یادیں" پڑھ کر لگا، میں نے ہی کسی اپنے کو کھو کر اُس کے کھونے کا دکھ لکھا ہو۔ تشنگی رہی۔ کچھ اور ہوتا۔

غضنفر صاحب کا افسانہ "حیرت فروش" شاید اور بھی اچھا، چبھتا ہوا اور پُر اثر ہو سکتا تھا! "حرفِ آغاز" آج کے حالات اور ملک کی سالمیت و تعمیر و ترقی کی ذمّے داریوں کی طرف آپ کا اشارہ۔

_____ انور شمیم، سمستی پور

○ نومبر کے شمارے میں جو چند مضامین خصوصی توجہ کے مستحق ٹھہرے ان میں ایک محمد عبدالحلیم صاحب کا "ناطق گلاؤٹھوی: احوال، افکار اور کلام" بھی ہے۔ انھوں نے مولانا کی زبانی ان کے سوانحی کوائف اور ادبی افکار تحریر کیے ہیں اس لیے اس مضمون کی اہمیت کچھ بڑھ گئی ہے۔

مولانا نے "مستورات اور شاعری" کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ ان کی وسعت نظری کی دلیل ہے۔ اُردو، فارسی میں تو خیر عورتوں کا زبردست رول رہا ہی ہے مگر عربی شعر و ادب کے ارتقا میں بھی ان کا حصّہ کچھ کم نہیں ہے۔ معاصر عربی ادب میں بعض ایسی خواتین شاعرات ہیں جو شعرا کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ نازک الملائکہ، فدوی طوقان اور سلمیٰ خضرا جیوسی آج کے دور کی ممتاز اور اہم ترین شاعرات کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ ان شاعرات نے عربی شعر و ادب کو نئے جہانِ تخیل اور جدید انداز و اسلوب بیان سے روشناس کرایا ہے۔ بعض ناقدین نے انھیں آوان گارد شاعرات میں نمایاں اہمیت کا حامل بتایا ہے۔

دیگر مضامین میں "راجندر سنگھ بیدی، کچھ یادیں" (سلام بن رزاق) اور "ہندی کا اُردو داں ادیب بھیشم ساہنی" (انیس احسن اعظمی) بہت پسند آئے۔ شعری حصّہ بھی خوب ہے۔ نامی انصاری کے شعروں نے خصوصی طور پر متاثر کیا۔

_____ عبدالحق حقانی، علی گڑھ

○ نومبر کے شمارے میں جناب خوشحال زیدی کا مضمون "بچوں کی لائبریری: ضرورت اور مسائل" اور جناب محمد الحلیم کا مضمون "ناطق گلاؤٹھوی: احوال، افکار اور کلام" کافی

[redacted]

یاتی اور دلچسپ مضامین ہیں۔ محمد عبدالحلیم
ب نے ناطق گلاؤٹھوی پر جنھیں لوگ
ب قریب بھول چکے ہیں جانکاری فراہم کی
مضمون کے مطالعے سے ناطق گلاؤٹھوی
ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔
پی اینڈ برار، (سی پی اب ایم۔ پی ہو گیا ہے
برار مہاراشٹر میں چلا گیا ہے) میں ناطق
ٹھوی، پروفیسر منظور حسین شور (ناگپور)
مولانا محمد علی (۳۶ گڑھ، رائے پور) جیسے
نہ ہوتے تو حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے
آج اردو کا نام و نشان نہ ملتا۔ ان تینوں
لوں نے اردو کی بے لوث خدمت کی اور
و کی روشنی کو جہاں تک ہو سکا زندگی بھر
لانے کی کوشش میں سرگرم عمل رہے۔
گڑھ اور برار میں آج اردو کا جو رواج ہے
بڑی حد تک بزرگوں کی انتھک کوششوں
رہونِ منت ہے۔

______ عبدالسلام کوثر، راجناندگاؤں

) "ایوانِ اردو" نومبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔
ں مضامین دلنشین ہیں بالخصوص "شکیل الرحمٰن"
سلامی فنون، فنِ تعمیر کی جمالیات" بہت
ور معلوماتی ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف
امی فنِ تعمیر کا پتہ چلتا ہے بلکہ سلاطین اسلام
س جہت میں پیش رفت کا خاکہ بھی سامنے
تا ہے۔

______ سید محمد ظفر امام، بدایوں

) نومبر ۹۰ء کے شمارے میں پُر از معلومات
یں" اسلامی فنون: فنِ تعمیر کی جمالیات"
ناطق گلاؤٹھوی: احوال، افکار اور کلام"
ی کی چیز ہیں۔ مؤخر الذکر مقالے میں ص ۳۴
اپر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

برد اللہ مرقدہ کے مادۂ تاریخ وفات کا میزان ۱۳۲۳ھ ہوتا ہے جو ازراہِ سہو ۱۹۰۵ء درج ہو گیا ہے۔ البتہ یہ عیسوی سنہ ۱۳۲۳ھ کے معادل ہے۔

اول الذکر مقالے "اسلامی فنون... فنِ تعمیر کی جمالیات" میں صاحب مقالہ کا عیسوی سنین کے مطابق ہجری سنین ارقام فرمانا مقالے کی افادیت میں اضافے کا موجب ہوتا۔

عرشی زادہ صاحب کی نظم "ادھوری داستان، نذر رودکی" انفرادیت لیے ہوئے ہے اور ان کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ سرِ ورق ایسا دلکش و نازک کہ:

نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

______ عبدالرؤف خاں، اودگی کلاں

○ نومبر ۹۰ء کے "ایوانِ اردو" کا "سرودِ رفتہ" پڑھ کر ایک اور غلطی کا ازالہ ہو گیا۔ کافی بحث کے بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں" مضطر خیر آبادی کی غزل ہے۔ پچھلے مہینے کے "سرودِ رفتہ" سے یہ معلوم ہوا کہ شعر: "عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی..." بھی شاہ ظفر کا شعر نہیں بلکہ سیماب اکبر آبادی کا ہے اور اس مہینے یہ پتہ چلا کہ مشہور و مقبول غزل "سرفروشی کی تمنا اب..." محمد حسن بسمل عظیم آبادی کی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ غزل رام پرشاد بسمل کی ہے۔

______ ابرار حسین، دھنباد

○ "ایوانِ اردو" پڑھنے والوں میں میرا بھی شمار ہے۔ میری رائے ہے کہ "ایوانِ اردو" میں اردو تخلیقات کے تراجم بھی شائع کیے جائیں۔ اس کے علاوہ دیگر ممالک کی زبانوں کی نگارشات کا جو جغرافیائی۔ تاریخی اور سائنسی موضوعات پر ہوں، اردو میں ترجمہ کر کے گاہے بگاہے "ایوانِ اردو" میں شائع کی جائیں۔

______ عبدالحمید کاغذی، جلگاؤں

○ "ایوانِ اردو" کا میں ایک قدیم قاری ہوں اور شیدائی بھی۔ حقیقتاً یہ رسالہ اردو کا ایوان ہے۔ مضامین، افسانے، غزلیں اور نظمیں کافی معیاری ہوتی ہیں۔ کتابت اور طباعت بھی ماشاءاللہ بہت خوب۔ "آزاد نمبر" جو آپ نے نکالا وہ میرے پاس موجود ہے۔ اب میری آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ "مولانا محمد علی جوہر" نمبر شائع کریں میری دیرینہ آرزو اور تمنا ہے۔ آپ کے سوا کوئی اتنا خوبصورت نمبر نہیں نکال سکتا۔

______ عبدالحق انصاری، رانچی

○ ماہ دسمبر ۹۰ء کا "ایوانِ اردو" وصول ہوا۔ خصوصاً افسانے بے حد پسند کئے۔ آپ پرانے قلم کاروں کے ساتھ نئے قلم کاروں کو بھی جگہ دے رہے ہیں۔ یقیناً یہ عمل لائقِ ستائش ہے۔ فرزانہ خان کا مختصر افسانہ "بیساکھی" بے حد پسند آیا۔ اس افسانے کے ذریعے محترمہ عورت کی نفسیات کو قارئین تک پوری طرح پہنچانے میں کامیاب رہی ہیں۔ فنکار جو بات لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے اگر وہ اس طرح پہنچ جائے تو یہ اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

______ سید ساجد علی، ٹونک

○ یہ خط صرف ایک بات جاننے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ وارث مظہری صاحب نے اپنے مراسلے (مطبوعہ ایوانِ اردو بابت ماہ دسمبر ۹۰ء) میں تحریر فرمایا ہے: "مذہبی نظریات کے مطابق بھوت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جن کی قبیل سے ہے۔" میں ان سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ "مذہبی نظریات" ان کی نظر سے کہاں گزرے ہیں غالباً یہاں مذہبی نظریات سے ان کی مراد اسلامی نظریات ہیں۔ برائے عنایت یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ قرآن مجید یا حدیث شریف میں کہاں بھوت کو

جن کی قسموں میں سے ایک قسم کا بیان کیا گیا ہے۔
اس طرح کی رائے زنی سخت غیر ذمے دارانہ اور نہایت گمراہ کن ہے جس سے اسلام کے بارے میں غلط تاثرات کی اشاعت ہوتی ہے۔ ایک طرف انھوں نے لکھا ہے کہ "مذہبی نظریات سے متعارض مضمون تو آپ کو چھاپنا ہی نہیں چاہیے" اور دوسری طرف خود ایسی بات لکھی ہے جو مذہبی نظریات سے قطعاً متعارض ہے۔

اس کے برخلاف جناب علی عباس ناز کل کا مراسلہ مبنی برحقیقت ہے اور ان کی صحیح فہم اور روشن خیالی پر دلالت کرتا ہے۔

—— ریاض الرحمٰن شروانی، علی گڑھ

○ "ایوانِ اُردو" کے شروع کے چند شمارے میری لائبریری میں موجود نہ ہوں گے، بعد کا ہر شمارہ میری نگاہوں اور مطالعے کا اسیر ہے۔ میری نظر میں "ایوانِ اُردو" واحد جریدہ ہے جو ملک کے نامور اور پرانے ادیبوں کا تعاون حاصل کرتے ہوئے بھی نئے لکھنے والوں کے جوہروں کو چمکنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اور جس کے کچھ صفحات نوجوان شاعروں اور ہونہار ادیبوں کی تخلیقات کے لیے وقف ہیں نیز اُردو ادب کی تقریباً تمام اصناف اس ایک رسالے میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

—— انیس عادل، بمبئی

اُردو اکادمی، دہلی

گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۹۸۶ء کی مطبوعات

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے۔ مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم۔ قیمت ۳۸ روپے۔

۲۔ بزمِ آخر۔ مصنف: منشی فیض الدین۔ مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی۔ قیمت ۲۱ روپے۔

۳۔ دلّی کی آخری شمع۔ مصنف: مرزا فرحت اللہ بیگ۔ مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین۔ قیمت ۲۳ روپے۔

۴۔ دلّی کا آخری دیدار۔ مصنف: سید وزیر حسن دہلوی۔ مرتب: سید ضمیر حسن دہلوی۔ قیمت ۱۰ روپے۔

۵۔ دلّی والے۔ مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین۔ قیمت ۳۶ روپے۔

۶۔ قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں۔ مصنف: عرش تیموری۔ مرتب: ڈاکٹر اسلم پرویز۔ قیمت ۱۷ روپے۔

۷۔ رسوم دہلی۔ مصنف: سید احمد دہلوی۔ مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم۔ قیمت ۲۰ روپے۔

۸۔ داغ دہلوی: حیات اور کارنامے۔ مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی۔ قیمت ۳۱ روپے۔

۱۹۸۷ء کی مطبوعات

۹۔ بزمِ انتخاب: دلّی۔ مصنف: مہیشور دیال۔ قیمت ۳۵ روپے۔

۱۰۔ مرثیۂ دہلی۔ مصنف: شاہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی۔ مرتب: مرغوب عابدی۔ قیمت ۱۷ روپے۔

۱۱۔ خواجہ حسن نظامی: حیات اور کارنامے۔ مرتب: خواجہ حسن ثانی نظامی۔ قیمت ۲۹ روپے۔

۱۲۔ دیوانِ حالی۔ مصنف: مولانا الطاف حسین حالی۔ مقدمہ: رشید حسن خاں۔ قیمت ۴۴ روپے۔

۱۳۔ چراغِ دہلی۔ مصنف: میرزا حیرت دہلوی۔ قیمت ۳۹ روپے۔

۱۴۔ اُردو صحافت۔ مرتب: انور علی دہلوی۔ قیمت ۳۲ روپے۔

۱۵۔ دہلی کے اسکولوں میں اُردو نصاب کے مسائل۔ مرتب: صدیق الرحمان قدوائی۔ قیمت ۲۳ روپے۔

۱۶۔ نوبتِ پنج روزہ یعنی وداعِ ظفر۔ مصنف: علامہ راشد الخیری۔ مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ قیمت ۲۳ روپے۔

۱۷۔ دلّی کی آخری بہار۔ مصنف: علامہ راشد الخیری۔ مرتب: سید ضمیر حسن دہلوی۔ قیمت ۲۰ روپے۔

۱۸۔ اُردو غزل۔ مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی۔ قیمت ۳۱ روپے۔

۱۹۔ اُردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب۔ مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی۔ قیمت ۳۹ روپے۔

۲۰۔ لال قلعے کی ایک جھلک۔ مصنف: حکیم خواجہ سید ناصر نذیر الدین فراق دہلوی۔
مرتب: ڈاکٹر انتظار مرزا۔ قیمت ۱۹ روپے۔

۲۱۔ دلّی کی تہذیب۔ مرتب: ڈاکٹر انتظار مرزا۔ قیمت ۱۰ روپے۔

۲۲۔ ڈائرکٹری اُردو ناشرین و تاجران کتب۔ مرتب: انور علی دہلوی۔ قیمت ۵۰ روپے۔

۲۳۔ مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب۔ مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی۔ قیمت ۳۱ روپے۔

۱۹۸۸ء کی مطبوعات

۲۴۔ نیا اُردو افسانہ: تجزیہ اور مباحث۔ مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ قیمت ۶۰ روپے۔

۲۵۔ انتخابِ کلامِ داغ۔ مرتبہ: بیگم ممتاز میرزا۔ قیمت ۲۴ روپے۔

۲۶۔ دلّی والے (جلد دوم)۔ مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین۔ قیمت ۵۶ روپے۔

۲۷۔ دہلی اور اس کے اطراف۔ مرتبہ: ڈاکٹر صادقہ ذکی۔ قیمت ۲۵ روپے۔

۲۸۔ دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات۔ مصنف: بیگم ریحانہ فاروقی۔ قیمت ۲۰ روپے۔

۲۹۔ دلّی کی درگاہ شاہ مرداں۔ مصنف: ڈاکٹر خلیق انجم۔ قیمت ۳۲ روپے۔

۳۰۔ حواشی ابوالکلام آزاد۔ مرتب: سید مسیح الحسن۔ قیمت ۴۲ روپے۔

۳۱۔ اُردو میں بارہ ماسے کی روایت۔ مصنف: ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ قیمت ۴۹ روپے۔

۳۲۔ دلّی کے آثارِ قدیمہ۔ مصنف: ڈاکٹر خلیق انجم۔ قیمت ۴۰ روپے۔

۳۳۔ اشاریہ آج کل۔ مرتبہ: جمیل اختر۔ قیمت ۷۷ روپے۔

۱۹۸۹ء کی مطبوعات

۳۴۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر۔ مصنف: پروفیسر نور الحسن۔
قیمت ۲۶ روپے

۳۵۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین۔ مرتب: ڈاکٹر اسلم پرویز۔ قیمت ۴۷ روپے

۳۶۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل۔ مرتب: پروفیسر عنوان چشتی۔ قیمت ۶۱ روپے

۳۷۔ نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس، اکادمی کی پیش کش۔ قیمت ۳۰ روپے

۳۸۔ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد اوّل)۔ مرتب: ڈاکٹر سید مظفر حسین برنی۔ قیمت ۱۷۰ روپے

۳۹۔ رنگ ہزاروں خوشبو ایک۔ شعری مجموعہ۔ بیکل اُتساہی۔ قیمت ۲۸ روپے

۴۰۔ انشائے ہادی النساء۔ مصنف: سید احمد دہلوی۔ قیمت ۲۲ روپے۔

۱۹۹۰ء کی مطبوعات

۴۱۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی (تین جلدوں میں)۔ مصنف: مولوی بشیر الدین احمد
(مکمل سیٹ) قیمت ۴۰۰ روپے

۴۲۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ۔ مرتب: پروفیسر قمر رئیس۔ قیمت ۴۸ روپے

۴۳۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم۔ مرتب: ڈاکٹر عتیق اللہ۔ قیمت ۴۸ روپے

۴۴۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق۔ مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ قیمت ۴۸ روپے

۴۵۔ آثار الصنادید (تین جلدوں میں)۔ مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم۔ (مکمل سیٹ) قیمت ۴۰۰ روپے

۴۶۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح۔ مرتب: ڈاکٹر مظفر حنفی۔ قیمت ۴۴ روپے

۴۷۔ فوائد الفواد۔ ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی۔ قیمت ۸۶ روپے

- اکادمی کی شائع کردہ کتابیں بذریعہ آفسیٹ طبع ہوتی ہیں۔
- اکادمی کی سیل ڈپو کا کوئی سول ڈسٹری بیوٹر نہیں ہے۔
- اکادمی کی ۱۰ فی صد کمیشن پر کتابیں فروخت کی جائیں گی۔
- کتب فروشوں کو مبلغ پانچ سو روپے تک کی کتابوں پر ۳۳ فی صد
اور پانچ سو روپے سے زائد کتابوں پر ۴۰ فی صد کمیشن دیا جائے گا۔

انچارج سیل ڈپو

Aiwan-e-Urdu Delhi, Issue No. 45 January 1991, Price Rs. 2.50 A.H.W.
Registered with the Registrar of News Papers at R. N. No. 45988/87 Delhi Postal Regd. No. D



کسی کا ہو بُرا، سرو وسمن کی یاد ہیں
گر پڑے آنسو ہمارے دامنِ صیّاد میں

ادمانی کا مزا کیا، غم نہ ہو جب تک شریک
شورِ ماتم چاہیے، شورِ مبارک باد میں

پنے اپنے کام کی دونوں کو ہے دن رات فکر
میں ہوں دل کی یاد میں، دل ہے تمھاری یاد میں

نہ کُھلواؤ، وگرنہ بگڑو گے سُن سُن کے تم
شکوۂ بے داد ہیں پنہاں مری فریاد میں

برے دل سے پوچھو، آرامِ اسیری کے مزے
نیند کے آتے ہیں جھونکے دامنِ صیّاد میں

ل سے باتیں کرتے کرتے، بن گیا میں بے زباں
خود فراموشی ہوئی حاصل تمھاری یاد میں

تو مَیں ہوں تسلیم، شاگردِ نسیم دہلوی
پر کہاں وہ رنگ جو تھا حضرتِ اُستاد میں